ماہنامہ

حکمتِ قرآن

لاہور

مدیر مسئول:

ڈاکٹر اسرار احمد

مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور
۳۶-کے، ماڈل ٹاؤن - لاہور ۱۴

وَمَن يُؤتَ الحِكمَةَ فَقَد أُوتِيَ
خَيراً كَثِيراً

(البقرہ : ۲۶۹)

ماھنامہ حکمتِ قرآن لاھور

جاری کردہ : ڈاکٹر محمد رفیع الدین، ایم اے، پی ایچ ڈی، ڈی لٹ، مرحوم

مدیر اعزازی : ڈاکٹر ابصار احمد ایم اے، ایم فل، پی ایچ ڈی،

معاون مدیر : حافظ عاکف سعید، ایم اے (فلسفہ)

—— یکے از مطبوعات ——

مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

۳۶-کے ماڈل ٹاؤن لاھور ۱۴

فون: ۸۵۰۹۱۱

زرِ سالانہ /۴۰ روپے

اس شمارے کی قیمت -/۴

فہرس

جلد اوّل	نومبر، دسمبر ۱۹۸۲ء	شمارہ: ۹، ۱۰

★ حکم وعبر ——— ۳
ڈاکٹر ابصار احمد

★ التوحید فی القرآن ——— ۷
پروفیسر یوسف سلیم چشتی

★ اشاعتِ قرآن کے لئے مولانا آزاد کے منصوبے ——— ۱۴
ڈاکٹر ابوسلمان شاہجہانپوری

★ قرآن کا تصورِ علم ——— ۳۳
ڈاکٹر ابصار احمد

★ قرآن مجید کے احسانات عربی زبان وادب پر ——— ۴۶
ڈاکٹر ذوالفقار علی ملک

★ انسان: صلاح وفسادِ عالم کا مرکزی کردار (۲) ——— ۶۱
مولانا الطاف الرحمٰن بنوی

ناشر: ڈاکٹر اسرار احمد

طابع: ایس اے سلیم ، مطبع: آفتاب عالم پریس لاہور

ابصار احمد

حکم و عبر

بعض تجدد پسند حلقوں اور افراد میں یہ خیال عام ہے کہ اسلام کی اصل روح بعض عالمگیر اخلاقی اقدار مثلاً انصاف، صداقت، سماجی بھلائی، دیانت، رواداری، اخوت اور صلۂ رحمی وغیرہ سے متعلق ہے۔ اور ان پر ایک یہودی، عیسائی، ہندو یا ملحد بھی عمل پیرا ہو کر ایک مسلمان کی طرح قابلِ ستائش انسان بن سکتا ہے۔ بلکہ وہ غیر مسلم افراد جو اپنے عمل میں ان اقدار کا مظاہرہ کرتے ہیں ان مسلمانوں سے بہتر ہیں جو مخصوص اسلامی الٰہیاتی عقاید رکھنے کے باوجود ان فضائل اخلاق پر کاربند نہیں ہوتے۔ خود راقم الحروف کو یونیورسٹی کے پوسٹ گریجویٹ شعبہ فلسفہ میں تعلیم اور بحث و تمحیص کے دوران چند سنجیدہ طلباء کی طرف سے اس نظریئے کی برملا تائید میں خیالات سننے کا اتفاق ہوا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ ایک طرف ان حضرات کا یہ خیال دین اسلام اور اس کے بنیادی تصورات سے لاعلمی پر مبنی ہے تو دوسری طرف اخلاقیات کے بھی فلسفیانہ اعتبار سے ایک نامکمل اور غیر منطقی تصور کی غمازی کرتا ہے۔ بعض عصری فلسفیانہ موشگافیوں کے زیر اثر ان لوگوں کا مذہب کے متعلق جو تصور بنتا ہے وہ یہ ہے کہ مذہب، اعلیٰ اخلاق اور متعلقہ جذبات و احساسات کا نام ہے۔ اور اس سے زیادہ کچھ نہیں۔ اس ضمن میں ان کی راہنمائی کئی مغربی مفکرین اور اہلِ دانش کرتے ہیں۔ جن میں سرِفہرست مشہور انگریز مصنف میتھیو آرنلڈ کا نام آتا ہے۔ آرنلڈ مذہب کی تعریف ان الفاظ میں کرتا ہے۔

"Religion is ethics heightened enkindled, lit uh by feeling" ——

یعنی مذہب اصلاً ان اخلاق سے عبارت ہے جن میں جذبات اور احساسات کی آمیزش ہو۔ لاریب دنیا کے تمام مذاہب کا اخلاقی تعلیمات کے ساتھ ساتھ چولی

دامن کا ساتھ ہے اور ہر مذہب میں بعض افعال کو فضائل اور بعض دوسرے افعال کو رذائل کی فہرست میں شامل کیا گیا ہے۔ لیکن مذہب اور اخلاقیات کو ہم معنی سمجھنا یقیناً ایک علمی گمراہی ہے۔ جو ہمارے نوجوانوں نے مغربی مفکّرین کی اندھی تقلید کے تحت قبول کی ہے۔ اگر وہ معروضی انداز میں اسلام کا مطالعہ کریں تو انہیں معلوم ہوگا کہ دینِ اسلام کی اساس ایمان باللہ ہے۔ یعنی ایک حیّ و قیّوم خدا پر ایمان اور اس کے ساتھ انتہائی محبّت کی روش۔ اور ظاہر ہے کہ یہ اساس اخلاقی اعمال سے پہلے آتی ہے۔ بالفاظِ دیگر دینِ اسلام کی روح اخلاقی رویّے سے زیادہ گہری بلکہ اس سے مقدم ایک داخلی ایمانی کیفیت پر مبنی ہے۔ یہ ایمان و ایقان خالقِ کائنات پر ہوتا ہے، صرف ایک مفروضے کی حیثیت سے نہیں بلکہ تعلق مع اللہ اور انابت الی اللہ کی پوری شدّتِ احساس کے ساتھ۔ ایمان کی اس حالت میں ان لوگوں کے دلوں میں اللہ کی محبّت تمام دوسری محبّتوں پر غالب آجاتی ہے۔ چنانچہ سورۂ بقرہ میں کہا گیا:

وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ (آیت ۱۶۵)	"جو ایمان والے ہیں وہ تو خدا کو ہی سب سے زیادہ دوست رکھنے والے ہیں۔"

ایک سچّا مسلمان اور مومن اپنے ہر ہر عمل سے گواہی دیتا ہے کہ وہ ایک علیم و خبیر ہستی کے وجود کا نہ صرف اقرار کرتا ہے۔ بلکہ اس ذات کو اپنی محبّت، عقیدت اور عبادت کا محور جانتا ہے اور اسے ہر اعلیٰ صفت سے متّصف مانتا ہے۔ چنانچہ اسلامی نقطۂ نظر سے ایک اخلاقی عمل صحیح مفہوم میں اخلاقی اسی وقت ہوگا۔ جب اس کی تہہ میں اللہ پر ایمان اور خشیتِ الٰہی کا جذبہ کارفرما ہو۔ اور یہ کام صرف اسی تعالیٰ کی رضا کے حصول کے لئے انجام دیا جائے اور دنیاوی اغراض پیشِ نظر نہ ہو۔ اسی کی وضاحت اس مشہور حدیثِ نبوی سے ہوتی ہے جس کے مطابق تمام اعمال کی قدر و منزلت کا انحصار نیت پر ہے۔

حیرت ہوتی ہے کہ ایک طرف اکثر تجدّد پسند مسلم حضرات قرآن کو منزّل من اللہ ماننے سے انکار نہیں کرتے لیکن بایں ہمہ اس کتاب کے مندرجات پر غور بھی نہیں کرتے۔ اگر وہ مندرجہ ذیل آیات قرآنیہ کا بغور مطالعہ کریں تو محولہ بالا خیال کا باطل ہونا خود بخود واضح ہو جاتا ہے۔

قُلْ هَلْ نُنَبِّئُكُمْ بِالْاَخْسَرِيْنَ اَعْمَالًا	"اے نبیؐ! ان سے کہو کیا ہم تمہیں بتائیں

اَلَّذِیْنَ ضَلَّ سَعْیُھُمْ فِی الْحَیٰوۃِ الدُّنْیَا وَھُمْ یَحْسَبُوْنَ اَنَّھُمْ یُحْسِنُوْنَ صُنْعًا ۔ (الکھف: ۱۰۴)

کہ اعمال کے اعتبار سے سب سے ناکام و نامراد کون لوگ ہیں۔ وہ لوگ ہیں۔ وہ لوگ کہ جن کی ساری سعی وجہد بھٹک کر رہ گئی۔ دنیا کی زندگی میں اور وہ سمجھتے رہے کہ وہ سب کچھ ٹھیک کر رہے ہیں۔"

اُولٰٓئِکَ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا بِاٰیٰتِ رَبِّھِمْ وَلِقَآئِہٖ فَحَبِطَتْ اَعْمَالُھُمْ فَلَا نُقِیْمُ لَھُمْ یَوْمَ الْقِیٰمَۃِ وَزْنًا۔ (الکھف: ۱۰۵)

"یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے اپنے رب کی آیات اور اس کے حضور پیشی کا انکار کیا۔ پس ان کے تمام اعمال حبط ہو گئے اور قیامت کے روز ہم انہیں کوئی وزن نہ دیں گے۔"

وَالَّذِیْنَ کَفَرُوْٓا اَعْمَالُھُمْ کَسَرَابٍ بِقِیْعَۃٍ یَّحْسَبُہُ الظَّمْاٰنُ مَآءً ۔ حَتّٰٓی اِذَا جَآءَہٗ لَمْ یَجِدْہُ شَیْئًا ۔ (النور: ۳۹)

"اور جن لوگوں نے کفر کیا ان کے اعمال کی مثال ایسی ہے جیسے دشتِ بے آب میں سراب کو پیاسا، پانی سمجھے ہوئے تھا۔ مگر جب وہاں پہنچا تو کچھ نہ پایا۔

مَثَلُ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا بِرَبِّھِمْ اَعْمَالُھُمْ کَرَمَادِ نِ اشْتَدَّتْ بِہِ الرِّیْحُ فِیْ یَوْمٍ عَاصِفٍ لَا یَقْدِرُوْنَ مِمَّا کَسَبُوْا عَلٰی شَیْءٍ ذٰلِکَ ھُوَ الضَّلٰلُ الْبَعِیْدُ ۝ (ابراھیم: ۱۸)

"جن لوگوں نے اپنے رب سے کفر کیا ان کے اعمال کی مثال اس راکھ کی سی ہے جسے ایک طوفانی دن کی آندھی نے اڑا دیا ہو۔ وہ اپنے کمائے کا کچھ بھی پھل نہ پا سکیں گے۔ یہی ہے پرلے درجے کی گمراہی (ضلالت)"

جہاں تک فلسفہ اخلاق کا تعلق ہے، اس میں شک نہیں کہ مذہبی عقیدے کے بغیر بھی 'انسان دوستی' (Humanism) کے مسلک پر چل کر ایک شخص اخلاقی اعتبار سے ایک حد تک ترفع حاصل کر سکتا ہے۔ لیکن تاریخ گواہ ہے کہ اعلیٰ ترین اخلاقی زندگیوں کے جتنے نمونے مذہبی افراد نے پیش کئے ہیں اس کا عشر عشیر بھی دوسرے گروپ کے افراد پیش نہیں کر سکتے۔ یہاں تفصیل میں جانے کا موقع نہیں۔ تاریخ فلسفۂ اخلاق

سے شغف رکھنے والے حضرات ان متعدد مفکرین کے خیالات سے واقف ہیں۔ جنہوں نے انسانی کی اخلاقی حس کو مذہبی شعور کا ایک اہم جزو تصور کیا ہے۔ ممکن ہوا تو انشاءاللہ آئندہ اسی سلسلۂ گفتگو کو آگے بڑھایا جائے گا۔

ہمیں افسوس ہے کہ ہم ایک بار پھر دو ماہ یعنی نومبر اور دسمبر کا اکٹھا پرچہ شائع کر رہے ہیں۔ قارئین بخوبی اندازہ لگا سکتے ہیں کہ کسی کام کے آغاز میں بہت سی مشکلات حائل ہوتی ہیں۔ ہم ان پر جلد از جلد قابو پانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ اور ہماری انتہائی کوشش ہوگی کہ (انشاءاللہ) جنوری ۸۳ء سے یہ باقاعدگی سے ہر ماہ شائع ہو۔ ہم قارئین سے اس سلسلے میں دعا کے طالب ہیں۔ چونکہ انجمن خدام القرآن لاہور کے تحت ایک ماہانہ جریدہ "میثاق" بھی شائع ہوتا ہے۔ اس لئے یہ فیصلہ کیا گیا ہے کہ "میثاق" ہر ماہ کی یکم اور "حکمتِ قرآن" ہر ماہ کی پندرہ تاریخ کو سپردِ ڈاک کیا جائے گا۔ قارئین نوٹ فرمالیں۔

اس شمارے کے بعض مضامین بھی ان مقالات پر مشتمل ہیں جو گذشتہ "قرآنی محاضرات" کے سلسلے میں قرآن اکیڈمی میں پیش کئے گئے۔ ہمیں امید ہے کہ قارئین انہیں مفید اور فکر انگیز پائیں گے۔

التوحید فی القرآن

از قلم:- پروفیسر یوسف سلیم چشتی

دنیا کی مذہبی کتابوں کے تقابلی مطالعہ سے یہ بات واضح ہوسکتی ہے کہ قرآن حکیم کے علاوہ کسی الہامی کتاب نے توحید باری تعالیٰ پر اس قدر زور نہیں دیا ہے۔ بقول پادری سی ایف اینڈریوز (Rev. Dr. C. F. Andrews) "دنیا میں صرف اسلام ہی ایسا مذہب ہے جس نے اپنا کلمہ ہی "لا الہ الا اللہ" مقرر کرلیا ہے۔ لیکن یہ بات بہت کم لوگوں کو معلوم ہے کہ قرآن ہی وہ واحد الہامی کتاب ہے جس نے شرک کی تمام ممکن صورتوں کا ابطال کرکے خالص توحید کا اثبات کیا ہے یعنی قرآن نے شرک فی الذات، شرک فی الصفات، شرک فی الحکم، شرک فی العبادت، شرک فی التصرف اور شرک فی الآثار — غرض کہ ہر ممکن صورت کا ابطال کردیا ہے۔ اس موضوع پر قرآن حکیم میں سو سے زائد آیات موجود ہیں۔ میں اس وقت ان میں سے چند آیات پیش کروں گا:-

(۱) وَلَا تَدْعُ مِنْ دُونِ اللّٰهِ مَا لَا يَنْفَعُكَ وَلَا يَضُرُّكَ ۖ فَإِنْ فَعَلْتَ فَإِنَّكَ إِذًا مِنَ الظَّالِمِينَ ۝ وَإِنْ يَمْسَسْكَ اللّٰهُ بِضُرٍّ فَلَا كَاشِفَ لَهُ إِلَّا هُوَ ۖ وَإِنْ يُرِدْكَ بِخَيْرٍ فَلَا رَادَّ لِفَضْلِهِ ۖ

(۱۰ — ۱۰۶ و ۱۰۷)

اور مت پکار اللہ کے سوا ایسے کو کہ نہ بھلا کرسکے تیرا نہ بُرا۔ پس اگر تو نے ایسا کیا، تو، تو بھی فوراً ظالموں میں سے ہو جائے گا۔ اور اگر اللہ تجھے کچھ تکلیف پہنچادے تو اس کے سوا کوئی اُس کو دور کرنے والا نہیں ہے۔ اور اگر اللہ تیرے ساتھ

بھلائی کرنا چاہے تو نہیں ہے کوئی اسے رد کرنے والا ط

(۲) اَنَدْعُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا يَنْفَعُنَا وَلَا يَضُرُّنَا ط

کیا ہم اللہ کو چھوڑ کر ایسوں کو پکاریں جو نہ ہمیں نفع پہونچا سکتے ہیں نہ نقصان پہونچا سکتے ہیں ؟ (۶-۷۱)

(۳) قُلِ ادْعُوا الَّذِيْنَ زَعَمْتُمْ مِّنْ دُوْنِهٖ فَلَا يَمْلِكُوْنَ كَشْفَ الضُّرِّ عَنْكُمْ وَلَا تَحْوِيْلًا ط (۱۷-۵۶)

اے رسولؐ! آپؐ منکرین سے کہدیں کہ تم اُن کو پکار کر دیکھ لو جن کو تم نے اللہ کو چھوڑ کر اپنا معبود بنا رکھا ہے کہ وہ نہ تو تم سے مصیبت کو دُور کر سکتے ہیں نہ بدل سکتے ہیں۔

(۴) وَالَّذِيْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖ لَا يَسْتَطِيْعُوْنَ نَصْرَكُمْ وَلَا اَنْفُسَهُمْ يَنْصُرُوْنَ ط (۷-۱۹۷)

اور وہ لوگ جن کو تم اللہ کے سوا، پکارتے ہو، نہ تو تمہاری مدد کر سکتے ہیں اور نہ اپنی ہی مدد کر سکتے ہیں۔

(۵) وَالَّذِيْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖ مَا يَمْلِكُوْنَ مِنْ قِطْمِيْرٍ ط اِنْ تَدْعُوْهُمْ لَا يَسْمَعُوْا دُعَآءَكُمْ وَلَوْ سَمِعُوْا مَا اسْتَجَابُوْا لَكُمْ ط (۳۵-۱۴)

اور جن کو تم پکارتے ہو اس کے سوا (خواہ وہ رسول ہوں یا نبی اور ولی ہوں یا اولادِ رسول) وہ تو کھجور کی گٹھلی پر جو چھلکا ہوتا ہے، اس کے بھی مالک نہیں ہیں کہ تمہیں بخش دیں۔ اگر تم انہیں پکارو گے تو وہ تمہاری پکار سُن بھی نہ سکیں اور (بفرضِ محال) اگر سُن بھی لیں تو تمہیں جواب نہیں دے سکتے۔

(۶) اِنَّ الَّذِيْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ عِبَادٌ اَمْثَالُكُمْ ط فَادْعُوْهُ فَلْيَسْتَجِيْبُوْا لَكُمْ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ط (۷-۱۹۴)

اللہ کو چھوڑ کر تم لوگ جن کو پکارتے ہو وہ تمہاری ہی طرح اللہ کے عاجز بندے ہیں (تو وہ تمہاری کیا مدد کر سکتے ہیں ؟) اگر تم سچے ہو تو انہیں پکارو، اور انہیں لازم ہے کہ وہ تمہاری پکار کا جواب دیں (اگر نہ دے سکیں تو سمجھ لو

کہ وہ تمہاری مدد بھی نہیں کرسکتے ۔)

(۷) یٰٓاَیُّهَا النَّاسُ اَنْتُمُ الْفُقَرَآءُ اِلَى اللّٰهِ وَاللّٰهُ هُوَ الْغَنِیُّ الْحَمِیْدُ ۔ اِنْ یَّشَاْ یُذْهِبْكُمْ وَیَاْتِ بِخَلْقٍ جَدِیْدٍ وَلَیْسَ ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ بِعَزِیْزٍ وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰی ۔

اے لوگو! تم سب (اپنی ہستی کے لئے) اللہ کی طرف محتاج ہو اور (صرف) اللہ ہی ہر چیز سے بے نیاز اور سب خوبیوں والا ہے ۔ اگر وہ چاہے تو تم سبھوں کو فنا کردے اور نئی مخلوق پیدا کردے ۔ اور یہ بات اللہ کے لئے کچھ بھی مشکل نہیں ہے اور کوئی شخص دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھائے گا ۔

(۸) اِنَّ الَّذِیْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ لَنْ یَّخْلُقُوْا ذُبَابًا وَّلَوِ اجْتَمَعُوْا لَهٗ وَاِنْ یَّسْلُبْهُمُ الذُّبَابُ شَیْئًا لَّا یَسْتَنْقِذُوْهُ مِنْهُ ۔ (۲۲-۷۳)

وہ لوگ جن کو تم اللہ کے علاوہ پکارتے (پوجتے) ہو (وہ اس قدر عاجز ہیں کہ) اگر سب مجتمع ہوجائیں تو مکھی بھی نہیں بنا سکتے اور اگر مکھی اُن سے کوئی چیز سلب کرلے تو وہ ہرگز واپس نہیں لے سکتے ۔

(۹) قُلِ ادْعُوا الَّذِیْنَ زَعَمْتُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ لَا یَمْلِكُوْنَ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ فِی السَّمٰوٰتِ وَلَا فِی الْاَرْضِ وَمَا لَهُمْ فِیْهِمَا مِنْ شِرْكٍ وَّمَا لَهُمْ مِّنْ ظَهِیْرٍ ۔ (۳۴-۲۲)

اے رسول! آپ ان مشرکوں سے کہہ دیجئے کہ تم جن کو اپنے خیال باطل میں، خدائی میں دخیل سمجھتے ہو، ان کو بلاؤ اور تحقیق کرو تو تمہیں معلوم ہو جائے گا کہ وہ نہ تو آسمانوں میں ذرّہ بھر اختیار رکھتے ہیں اور نہ زمین اور نہ زمین و آسمان کے بنانے میں ان کا کچھ اختیار یا ساجھا ہے اور نہ ان میں سے کوئی خدا کا مددگار ہے ۔

(۱۰) وَاتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِهٖٓ اٰلِهَةً لَّا یَخْلُقُوْنَ شَیْئًا وَّهُمْ یُخْلَقُوْنَ وَلَا یَمْلِكُوْنَ لِاَنْفُسِهِمْ ضَرًّا وَّلَا نَفْعًا وَّلَا یَمْلِكُوْنَ مَوْتًا وَّلَا حَیٰوةً وَّلَا نُشُوْرًا ۔ (۲۵-۳)

اوران مشرکوں نے اللہ کے علاوہ ان کو بھی الہ بنا رکھا ہے جنہوں نے کسی چیز کو پیدا نہیں کیا بلکہ خود مخلوق (پیدا شدہ) ہیں اور یہ (مِنْ دُوْنِ اللّٰہ) اسقدر عاجز ہیں کہ نہ تو اپنے آپ کو نفع پہونچا سکتے ہیں نہ ضرر کو دفع کر سکتے ہیں اور نہ ان کو موت یا زندگی یا دوبارہ زندگی پر کوئی قدرت حاصل ہے۔

(۱۱) ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ هُوَ الْحَقُّ وَاَنَّ مَا يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖ هُوَ الْبَاطِلُ وَاَنَّ اللّٰهَ هُوَ الْعَلِيُّ الْكَبِيْرُ (۲۲ - ۸)

یہ اس لیئے ہے کہ صرف اللہ ہی الحق (سچا خدا) ہے اور یہ لوگ اس کے علاوہ جسے بھی پکارتے ہیں وہ باطل (جھوٹ) ہے اور بیشک اللہ ہی بلند مرتبہ اور بزرگی والا ہے۔

(۱۲) يَدْعُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا يَضُرُّهٗ وَمَا لَا يَنْفَعُهٗ ط

وہ اللہ کو چھوڑ کر اسے پکارتا ہے جو نہ اس کو نقصان پہونچا سکتا ہے۔ نہ نفع پہونچا سکتا ہے۔ (۲۲ - ۱۲)

(۱۳) وَمَا يَتَّبِعُ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ شُرَكَآءَ ط اِنْ يَّتَّبِعُوْنَ اِلَّا الظَّنَّ وَاِنْ هُمْ اِلَّا يَخْرُصُوْنَ ط (۶۶ - ۱۰)

اور یہ جو پیچھے پڑے ہیں شریک پکارنے والے اللہ کے سوا، کچھ نہیں مگر پیچھے پڑے ہیں خیال کے اور کچھ نہیں مگر اٹکلیں دوڑاتے۔

(۱۴) وَالَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ لَا يَخْلُقُوْنَ شَيْئًا وَّهُمْ يُخْلَقُوْنَ ط اَمْوَاتٌ غَيْرُ اَحْيَآءٍ ج وَمَا يَشْعُرُوْنَ اَيَّانَ يُبْعَثُوْنَ ط

اور جن کو یہ مشرک اللہ کے سوا پکارتے ہیں، انہوں نے کوئی چیز پیدا نہیں کی بلکہ وہ تو خود پیدا کیئے گئے ہیں۔ وہ مُردہ ہیں، انیں کوئی زندگی نہیں ہے اور وہ یہ بھی نہیں جانتے کہ کب دوبارہ اُٹھائے جائینگے۔

(۱۵) قُلْ اَرَءَيْتُمْ مَّا تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَرُوْنِيْ مَاذَا خَلَقُوْا مِنَ الْاَرْضِ ط اَمْ لَهُمْ شِرْكٌ فِي السَّمٰوٰتِ ط وَمَنْ اَضَلُّ مِمَّنْ يَّدْعُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَنْ لَّا يَسْتَجِيْبُ لَهٗٓ اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ وَهُمْ عَنْ دُعَآئِهِمْ غٰفِلُوْنَ ط (۴۶ - ۴، ۵)

اے رسول ؐ آپ ان مشرکوں سے کہیں کہ جن کو تم اللہ کے علاوہ پکارتے ہو مجھے یہ تو بتا دو کہ انہوں نے دنیا میں کونسی چیز پیدا کی ہے ؟ کیا انکا آسمانوں (کی تخلیق) میں کچھ ساجھا ہے ؟ اور اُس سے بڑھ کر کون گمراہ ہو سکتا ہے جو اللہ کو چھوڑ کر اُسے پکارتا ہے جو قیامت تک اُس کی پکار کا جواب نہیں دے سکتا - اور وہ ان کی پکار سے بے خبر ہیں -

(۱۶) مَا لَكُمْ مِنْ دُونِهِ مِنْ وَّلِيٍّ وَّلَا شَفِيعٍ ط اَفَلَا تَتَذَكَّرُونَ ؟

اے لوگو! اللہ کے سوا تمہارے لئے نہ کوئی ولی (دوست) ہے نہ شفاعت کرنے والا - پس تم غور کیوں نہیں کرتے ؟ (۳۲ - ۴)

(۱۷) مَا لَكُمْ مِنَ اللّٰهِ مِنْ عَاصِمٍ ط (۴۰ - ۳۳)

اے لوگو! اللہ کے سوا تمہیں کوئی مصیبت سے بچانے والا نہیں ہے -

(۱۸) اَيُشْرِكُونَ مَا لَا يَخْلُقُ شَيْئًا وَّهُمْ يُخْلَقُونَ ط وَلَا يَسْتَطِيعُونَ لَهُمْ نَصْرًا وَّلَا اَنْفُسَهُمْ يَنْصُرُونَ ط (۷ - ۱۹۲)

کیا یہ لوگ اُن کو اللہ کا شریک بناتے ہیں جنہوں نے کوئی چیز پیدا نہیں کی بلکہ وہ خود پیدا کئے گئے ہیں ؟ اور یہ وہ عاجز لوگ ہیں جو نہ ان کی مدد کر سکتے ہیں نہ خود اپنی مدد کر سکتے ہیں -

(۱۹) مَا شَآءَ اللّٰهُ لَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ ط (۱۸ - ۴۰)

وہی ہوتا ہے جو اللہ چاہتا ہے اور اگر اللہ قوت نہ دے تو کسی شخص میں کوئی قوت یا طاقت نہیں ہے -

(۲۰) لِكَيْلَا تَاْسَوْا عَلٰى مَا فَاتَكُمْ وَلَا تَفْرَحُوْا بِمَا اٰتٰىكُمْ ط

جو چیز تم سے فوت ہو جائے یعنی جاتی رہے تو تم اس پر افسوس مت کرو (کیونکہ وہ خدا کے حکم سے فوت ہوئی ہے) اور اگر اللہ تمہیں کچھ عطا کرے تو اس پر اتراؤ مت (کیونکہ وہ چیز تمہاری قابلیت یا کوشش سے نہیں ملی ہے) (۵۷ - ۲۲)

(۲۱) وَهُوَ اللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ط لَهُ الْحَمْدُ فِي الْاُوْلٰى وَالْاٰخِرَةِ وَلَهُ الْحُكْمُ وَاِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ ط قُلْ اَرَءَيْتُمْ اِنْ جَعَلَ

اللّٰہُ عَلَیْکُمُ اللَّیْلَ سَرْمَدًا اِلٰی یَوْمِ الْقِیٰمَۃِ مَنْ اِلٰہٌ
غَیْرُ اللّٰہِ یَاْتِیْکُمْ بِضِیَآءٍ ؕ اَفَلَا تَسْمَعُوْنَ ؀ (۲۸ - ۷۰ - ۷۱)

اور وہ اللہ ہے جس کے سوا دوسرا الٰہ (ساری کائنات میں) نہیں ہے۔ ۲
حمد و ثنا صرف اُسی کے لئے زیبا ہے، دُنیا میں بھی اور آخرت میں بھی - اور
حکمرانی اُسی سے مختص ہے اور تم سب اسی طرف واپس آؤ گے کیا تم نے غور کیا؟
اگر اللہ رات کو قیامت تک طویل کردے تو کون ہے جو تمہیں روشنی عطا کرسکتا ہے؟
پس تم سُنتے کیوں نہیں (غور کیوں نہیں کرتے)

(۲۲) تَبٰرَکَ الَّذِیْ نَزَّلَ الْفُرْقَانَ عَلٰی عَبْدِہٖ لِیَکُوْنَ لِلْعٰلَمِیْنَ
نَذِیْرَا ۙ الَّذِیْ لَہٗ مُلْکُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَلَمْ یَتَّخِذْ
وَلَدًا وَّلَمْ یَکُنْ لَّہٗ شَرِیْکٌ فِی الْمُلْکِ وَخَلَقَ کُلَّ شَیْءٍ
فَقَدَّرَہٗ تَقْدِیْرًا ؀ وَاتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِہٖۤ اٰلِہَۃً لَّا یَخْلُقُوْنَ
شَیْئًا وَّھُمْ یُخْلَقُوْنَ وَلَا یَمْلِکُوْنَ لِاَنْفُسِہِمْ ضَرًّا وَّلَا نَفْعًا ۳
وَّلَا یَمْلِکُوْنَ مَوْتًا وَّلَا حَیٰوۃً وَّلَا نُشُوْرًا ؀ (۲۵ - ۱ و ۲)

مبارک ہے وہ ذات جس نے نازل کیا فرقان (قرآن) اپنے بندے پر
تاکہ وہ جہان والوں کے لئے نذیر ہو جائے - اللہ وہی ہے جس کے لئے بادشاہت
ہے آسمانوں اور زمین کی - اور اُس نے کسی کو اپنا بیٹا نہیں بنایا اور حکمت میں کوئی
اس کا شریک نہیں ہے اُسی نے ہر چیز کو پیدا کیا اور ہر شی کی تقدیر معین کی اور
مشرکوں نے اس کے علاوہ الہوں کو خدا بنا رکھا ہے جنہوں نے کسی چیز کو پیدا
نہیں کیا بلکہ وہ تو خود مخلوق ہیں (یعنی دوسروں کے محتاج ہیں)- اور نہ وہ اپنے آپ کو
نقصان پہنچا سکتے ہیں نہ نفع - اور نہ مالک ہیں موت کے اور زندگی کے اور نہ موت
کے بعد دوبارہ زندہ ہو جانے کے -

ان آیات میں، جو میرے دعوے کے اثبات کے لئے کافی ہیں، اللہ نے
الوہیت کا ہشت گانہ معیار بیان فرمایا ہے یعنی اللہ وہ ہے جو :-

۱ - اپنے بندوں یا بندے پر فرقان نازل کرسکے -
۲ - ساری کائنات پر حکومت کرسکے -

۳ - اُس کا کوئی فرزند یا رشتہ دار نہ ہو (مثلاً بیوی بچے)
۴ - اُس کا کوئی شریک یا معین نہ ہو۔
۵ - وہ خالقِ کائنات ہو۔
۶ - اس نے ہر شئ کی تقدیر معیّن کر دی ہو۔
۷ - وہ خود مخلوق یا مجبور یا محکوم نہ ہو۔
۸ - وہ بلکہ صفت دہی، نفع اور نقصان، موت اور زندگی، صحت اور مرض، عزّت اور ذلّت، تونگری اور افلاس راحت اور رنج کا مالک ہو۔

چونکہ کوئی انسان اس معیارِ ہشت گانہ پر پورا نہیں اُتر سکتا اس لئے منطقی طور پر بھی ثابت ہو گیا کہ کوئی انسان (خواہ وہ رسول کیوں نہ ہو) الٰہ نہیں ہو سکتا۔

❀❀❀❀❀❀❀❀

مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

کی ایک اور پیشکش

منکرین حدیث کے پیدا کردہ مغالطوں کے ازالے کی ایک اہم کوشش

یتیم پوتے کا حقِ وراثت

تالیف

سیّد غلام احمد رضوی

ایڈووکیٹ

بڑے سائز کے ۱۲۰ صفحات، سفید کاغذ پر آفسٹ کی طباعت

قیمت : -/۵ روپے

تعلیم و اشاعتِ قرآن کے لئے
مولانا آزاد کے منصوبے

ازقلم: ڈاکٹر ابوسلمان شاہجہانپوری

۱۹۱۲ء میں قرآن حکیم کی دعوت و تبلیغ عمومی کے لئے الہلال جاری کیا گیا تھا اور جب کہ بیج زمین کے سپرد کر دیا گیا تھا تو ضروری تھا کہ اس کے تحفظ و نشو و نما کے لئے دیگر سروسامان بھی کر دیا جائے۔ اس سلسلے میں جو معلومات ہمارے سامنے ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ الہلال کے ذریعہ تبلیغ و اشاعت تعلیمات الٰہیہ اور تعارف علوم و معارف قرآن کے بعد مندرجہ ذیل خاص اہتمام پیش نظر تھے۔

(۱) تعلیم و تربیت اصحاب استعداد کے لئے مدرسہ دارالارشاد کا قیام
(۲) تالیف و تدوین علوم و معارف قرآن اور ترجمہ و تفسیر کی اشاعت
(۳) تعلیم و اشاعت قرآن کے لئے ایک علمی ادارے کا قیام

مدرسہ دارالارشاد کا قیام

الہلال نے دعوتِ الی القرآن کی جو صدا حق بلند کی تھی اور اس دعوت کے شجر طیبہ نے جو برگ و بار پیدا کئے تھے۔ وہی سب کچھ مقصود نہ تھا۔ درحقیقت یہ دعوت کی پہلی منزل تھی، یہ زمین کا تیار کرنا تھا اور جب کہ یہ عمل حق ظہور میں آ چکا تھا تو ضروری تھا کہ منصوبے کے دوسرے مرحلے اور سفر کی دوسری منزل کا آغاز کر دیا جائے۔ مدرسہ دارالارشاد کا قیام اسی دوسری منزل کا ظہور اور دعوت حق کے بیج کو طالبان حق کی سرزمین قلوب کے سپرد کر دینا تھا۔ خود مولانا نے اس منزل کے ظہور اور نئی منزل کے مقصد سفر کے بارے میں فرمایا ہے۔

"چند سال پیشتر کا واقعہ ہے کہ مشیتِ الٰہی نے اس عاجز کی رہنمائی کی اور الہلال نے قرآن حکیم کی تبلیغ و دعوت کی صدا از سر نو بلند کی - لیکن اس عرصے میں جو کچھ ہوا وہ ایک دعوت عام تھی جس کے ذریعے فہم و بصیرت قرآن کی نئی راہیں عوام و خواص نے اپنے سامنے دیکھیں اور قرآن کریم کے عشق و شیفتگی کا ایک نیا ولولہ دلوں میں پیدا ہو گیا - تاہم اس دعوت کی ایک دوسری منزل ابھی باقی ہے اور وہی فی الحقیقت اہم تر مقام سعی و تعب ہے - یعنی قوم میں بکثرت ایسے افراد پیدا کئے جائیں جو انہی راہوں پر چل کر قرآن کریم کے علوم و معارف کو بہ تکمیل حاصل کریں اور ان کے ذریعے قوم میں ارشاد و ہدایت اور احیائے دعوت و ذکر کا عملی سلسلہ بالعموم شروع ہو سکے"

اسی مقالے میں لکھتے ہیں : دارالارشاد کا مقصد یہی ہے، دعوت الی القرآن کی اس دوسری منزل کا سروسامان ہو اور تھوڑے وقت اور بہت زیادہ صرف علم و فکر سے ایک ایسی جماعت پیدا کی جائے جو قرآن حکیم کی دعوت و تبلیغ کی خدمت اور اصلاح و ارشاد امت کا فرض انجام دے[1]

چنانچہ اس منصوبے کے سلسلے میں کلکتہ کے مشرقی جانب میونسپلٹی کے حدود سے باہر ایک قطعہ زمین حاصل کر لیا گیا تھا - یہ قطعہ زمین مولانا آزاد کے والد مولوی خیرالدین مرحوم کے ایک مرید حاجی مصلح الدین کی ملکیت تھا جو انہوں نے اس مقصد کے لئے وقف کر دیا تھا - اس میں ایک مسجد کی تعمیر پایۂ تکمیل کو پہنچ گئی تھی اور یکم رمضان ۱۳۳۰ھ (جولائی ۱۹۱۲ء) کو مدرسہ کے دارالجماعہ (لیکچر روم) کا سنگ بنیاد بھی رکھ دیا گیا تھا - کوشش کی گئی تھی کہ دارالجماعہ کی تعمیر جلد مکمل ہو جائے تاکہ تعلیم و تدریس اور تربیت اصحاب استعداد طالبان حق کا کام شروع کر دیا جائے[2] لیکن جب چند روز چند موانع کے باعث یہ ممکن نہ ہوا تو کرایہ کی ایک عمارت میں درس و تعلیم قرآن کا آغاز کر دیا گیا - البلاغ کے پہلے ہی شمارے میں مولانا تحریر فرماتے ہیں !

"گزشتہ سال رمضان میں "دارالارشاد" کی بنیاد رکھی گئی ۔ ۔ ۔ ۔
ارادہ تھا کہ اسی سال سے تعلیم و ارشاد کا سلسلہ بھی شروع کر دیا

(حاشیہ اگلے صفحے پر دیکھئے)

جائے - لیکن مشیت الٰہی مساعد نہ ہوئی -

موجودہ حالت یہ ہے کہ مدرسہ کا ہال تیار ہو چکا ہے - لیکن جب تک طلبا کے قیام کے لئے ایک دوسری عمارت تیار نہ ہو جائے، وہاں کام شروع نہیں ہو سکتا - اس کے لئے اقلاً دس پندرہ ہزار روپے اور ہونا چاہیئے - کمروں کی تیاری کا انتظار میں کر سکتا ہوں لیکن نہ تو میری زندگی کر سکتی ہے (جس کا قیام نامعلوم) اور نہ زمانہ کر سکتا ہے (جس کی رفتار ہمارے ارادوں اور امیدوں کی پابند نہیں)، پس متوکلاً علی اللہ اس عاجز نے پچھلے دنوں فیصلہ کر لیا کہ سردست ایک کرائے کے مکان میں سلسلۂ تدریس وارشاد شروع کر دیا جائے -

بایں کہ کعبہ نمایاں شود زپا منشیں کہ نیم گام جدائی ہزار فرسنگ است

غرض کہ مسلمانوں کی داخلی اصلاح واحیائے علم وعمل اور غیر قوموں میں اسلام کی تبلیغ کے لئے دارالارشاد کھول دیا گیا ہے اور طلبہ کے لئے ایک دو منزلہ مکان شہر کے یورپین کوارٹر میں لے لیا گیا ہے" [۳]

مارچ ۱۹۱۶ء میں حدود بنگال سے مولانا آزاد کے اخراج کے بعد چونکہ الہلال پریس اور دفتر کی خانہ تلاشی میں چونکہ حزب اللہ کے ارکان کا رجسٹر اور مدرسۂ دارالارشاد اور اس کے طلبہ کے متعلق تمام کاغذات پولیس کے قبضے میں چلے گئے تھے جو بعد میں نہ مل سکے - اس لئے آج ہمارے پاس مدرسہ کے بارے میں الہلال کے بعض مضامین میں صرف اشارات سے زیادہ کوئی معلومات نہیں ہیں - البتہ تحریک ریشمی رومال کے سرکاری ریکارڈ سے قومی وملی زندگی کے بارے میں جو بہت ہی مفید معلومات دستیاب ہوئی ہیں اس میں مدرسہ دارالارشاد کے قواعد وضوابط اور اس کے چند طلبہ کے نام بھی ہیں - رپورٹ میں ہے -

"مدرسہ دارالارشاد مولانا ابوالکلام آزاد نے ۱۹۱۵ء میں کلکتہ میں قائم

---

[۱] آزاد، ابوالکلام، البلاغ، کلکتہ - ۱۲ر نومبر ۱۹۱۵ء [۲] آزاد، ابوالکلام، حزب اللہ دارالجماعہ کی تاسیس (مقالہ) الہلال، کلکتہ، ۲۹ر جنوری ۱۹۱۴ء، ص ۵ [۳] آزاد، ابوالکلام، البلاغ، کلکتہ، ۱۲ر نومبر ۱۹۱۵ء

کیا - دیکھنے میں یہ ایک تعلیمی ادارہ ہے جو قرآن و حدیث کی ہدایات کے عین مطابق چلایا جاتا ہے لیکن شرائط داخلہ کو دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ وقوف علم کے ساتھ اتحاد اسلامی کا فروغ اس کالج کا مقصد ہے - اس میں داخلہ کی بعض شرائط شری آربندو گھوش کے مانک ٹولہ گارڈن گیتا اسکول کی شرائط سے ملتی جلتی ہیں - کالج میں داخلہ تمام میٹرک پاس، انڈر گریجویٹ اور گریجویٹ مسلمانوں کے لئے کھلا ہے - تمام طلبہ پر چھ ماہ کی ٹریننگ کا کورس پورا کرنے کی پابندی ہے - اس کے بعد وہ آزاد ہیں چاہے دارالارشاد کے مقاصد کے لئے کام کریں یا کوئی پیشہ خود اختیار کر لیں مولوی محی الدین عرف برکت علی ولد مولوی عبدالقادر پلیڈر قصور، محمد حسین زمان آف گوجرانوالہ جواب ٹریفک مینجر نارتھ ویسٹرن ریلوے لاہور کے دفتر میں کلرک ہے، ضلع سیالکوٹ کا محمد اکبر اور محمد یونس پسر شیخ محمد یوسف آف گجرات دارالارشاد کلکتہ کے طالب علم رہے ہیں - ڈیفنس ایکٹ کے تحت کلکتہ سے مولانا ابوالکلام آزاد کے اخراج کے بعد سے غالبا ادارہ بند ہے[1]۔"

پولیس کی اس رپورٹ کے مطابق دارالارشاد میں مولانا آزاد سے استفادہ کرنے والوں میں ان حضرات کے علاوہ خواجہ عبدالحی فاروقی، مستری محمد صدیق، نجم الدین احمد وغیرہ کے اسمائے گرامی معلوم ہیں - مدرسہ دارالارشاد میں مولانا آزاد کے علاوہ جو اساتذہ کام کرتے تھے ان میں سے ہمیں صرف مولوی مظہر الدین شیر کوٹی جو بعد میں الامان دہلی کے ایڈیٹر کی حیثیت سے مشہور ہوئے، کا نام ہمارے علم میں آیا ہے[2]

تبلیغ اسلام اور اشاعت تعلیم کتاب و سنت کے لئے مولانا آزاد نے جماعت حزب اللہ کے تحت المسائحون العابدون کے خصائص و صفات کی حامل ایک جماعت بھی بنائی تھی اور اس کے لئے چند طالبان حق منتخب کر لئے تھے جنہوں نے اپنی سیاحت رشد و ہدایت شروع بھی کر دی تھی - اس سیاحت کا دائرہ اگرچہ

---

[1] محمد میاں، مولانا سید (مرتب)، تحریک شیخ الہند، لاہور: مکتبہ رشیدیہ لمیٹڈ، ۱۹۷۵ء، ص ۱۸ - ۴۱۷ - [2] ایضاً، ص ۴۴۷

بیرون ہند اور کرۂ ارضی کے تمام اقطاع و ممالک تک پھیلا ہوا تھا لیکن اس کا آغاز برصغیر کے دیار و امصار کی سیاحت و تبلیغ سے کیا گیا تھا۔ اس منصوبے کے مقاصد اور طریقۂ کار کا نقشہ مولانا آزاد کے الفاظ میں یہ ہے:

جامع لفظوں میں انکا مقصد یوں بیان کیا جا سکتا ہے کہ "مسلمانوں نے دینی اعتقادات و اعمال کی اصلاح و درستگی، اور انہیں اعتقاداً و عملاً ایک سچا مسلمان، راسخ الاعتقاد مومن، اور اولوالعزم و بلند ارادہ مجاہد فی سبیل اللہ بنا دینے کی سعی کرنا، اور مسلمانوں کے عام طبقات کے اندر وہ تمام معلومات ضروریہ اپنے وعظ و بیان سے پیدا کر دینا، جو ایک عالم و صاحب فضل شخص کو از روئے علم و کتاب حاصل ہیں۔

اس کے لئے ضروری ہے کہ ایسے لوگ مختلف مقامات میں رہ جائیں، اور عرصے تک کیلئے اس طرح مقیم ہو جائیں گویا وہی انکا گھر ہے اور وہیں ان کو آخر تک بسنا اور زندگی گذارنا ہے۔ سلف صالحین کے داعیوں کا یہی اسوۂ حسنہ ہمارے سامنے ہے۔ محض ادعائی واعظوں کی چند روزہ گشتوں اور دوروں سے نہ تو کبھی کوئی اثر پیدا ہوا ہے۔ اور نہ کسی گروہ کے اندر اس سے کوئی تبدیلی پیدا ہوگی۔ تبدیلی تعلیم سے پیدا نہیں ہوتی بلکہ ان چیزوں سے حاصل ہوتی ہے جن کے لئے محض شریعت کے بھیج دینے کی جگہ انبیاء کرام علیہم السلام کے ظہور و قیام کو اللہ نے ضروری قرار دیا تھا۔

"پس وہ اپنے تمام تعلقات و محبوبات سے بے پروا ہو کر خدمت اسلام و مسلمین کے رشتے کو ترجیح دیں گے، اور ایک روز سے لے کر سالہا سال تک کے لئے مقیم ہو جائیں گے، تاکہ ان کی خدمات کے قابل اطمینان نتائج پیدا ہو جائیں اور مزید قیام کی ضرورت باقی نہ رہے۔

ان کا طریق درس قرآن و سنت و علوم تعلیم و تبلیغ انہی اصولوں کے ماتحت ہوگا جو دعوۃ الہلال کے اصل الاصول ہیں۔" [1]

علمی و تصنیفی منصوبہ تالیف و ترتیب علوم و معارف قرآنی کے سلسلے میں مولانا کے پیش نظر جو منصوبہ تھا وہ انہوں نے اس زمانے میں مرتب

---

[1] آزاد، ابوالکلام: جماعت حزب اللہ (مقالہ) الہلال، کلکتہ، ۸ جولائی ۱۹۱۴ء ص ۲۹

کر لیا تھا - اس کے مطابق مولانا کے سامنے تین تالیفات تھیں -

۱ - تفسیر البیان فی مقاصد القرآن

۲ - ترجمان القرآن

۳ - مقدمہ تفسیر الموسوم بہ البصائر

ان تالیفات کی تیاری کا آغاز بھی مولانا نے مدرسہ دارالارشاد کے قیام کے منصوبے کے ساتھ کر دیا تھا - مولانا لکھتے ہیں -

"۱۹۱۵ء میں جب میں نے اس کام کا ارادہ کیا، تو بیک وقت تین چیزیں پیش نظر تھیں، ترجمہ، تفسیر اور مقدمہ تفسیر - میں نے خیال کیا تھا کہ یہ تین کتابیں قرآن کے فہم و مطالعہ کی تین مختلف ضرورتیں پوری کر دیں گی - عام تعلیم کے لئے ترجمہ، مطالعہ کے لئے تفسیر اور اہل علم و نظر کے لئے مقدمہ[1]"

چنانچہ نومبر ۱۹۱۵ء میں البلاغ نکلا تو اس کے پہلے شمارے میں تفسیر کا اشتہار دوسرے پرچے میں ترجمان القرآن کا اشتہار اور تیسرے نمبر میں مقدمہ تفسیر کا اعلان تھا پروفیسر محمد اجمل خان لکھتے ہیں -

"(البلاغ نمبر ۱) کے آخر میں رسالہ "تفسیر البیان فی مقاصد القرآن" کا اشتہار تھا جو ہر ماہ نصف حصہ مقدمۂ تفسیر اور نصف تفسیر سورۂ فاتحہ پر مشتمل ہوگا۔

البلاغ نمبر ۲، ۲۶ نومبر ۱۹۱۵ء میں سرورق پر "ترجمان القرآن" کا اشتہار تھا - اس میں بتایا گیا تھا کہ شاہ ولی اللہ نے سو برس پہلے فارسی میں ترجمہ کیا، پھر شاہ رفیع الدین اور شاہ عبدالقادر نے اردو ترجمے کئے - اب اس بنیاد کی تکمیل کا شرف خدا نے ایڈیٹر الہلال کو دیا ہے - ترجمان القرآن اردو بحمداللہ لیتھو میں زیر طبع ہے -"

البلاغ نمبر ۳، ۱۰ دسمبر ۱۹۱۵ء میں مندرجہ بالا اشتہارات کے علاوہ یہ تحریر ہے کہ

"تفسیر کے علاوہ ایک اور اہم اور مستقل چیز تفسیر کا مقدمہ ہے - ان شاء اللہ اس کے ابتدائی اجزاء بھی البیان کی اولین اشاعت کے ساتھ شائع ہوجائیں گے اور پھر اصل تفسیر کے ساتھ چھپتے رہیں گے - اُمید ہے

---

[1] آزاد ابوالکلام، ترجمان القرآن، دفتر ترجمان القرآن ۱۹۳۱ء اشاعت اول، جلد اول ص ۵۹

کہ مقدمہ جلد مرتب ہوجائے گا کیوں کہ وہ ایک محدود و مرتب چیز ہے۔

البلاغ مورخہ ۱۴ و ۲۱ - جنوری ۱۹۱۶ء میں تحریر ہے کہ البیان و ترجمان القرآن کے لئے احباب کو اور انتظار کرنا چاہیئے - حتی الامکان پوری کوشش کی جا رہی ہے کہ اس کا سلسلہ جلد شروع ہو جائے - تفسیر و مقدمہ شائع ہوجاتا لیکن ان کے مقدمہ کی وجہ سے دیر ہوگئی - کیونکہ معلوم ہوا ہے کہ پہلے نمبر کے ساتھ مقدمہ پورا شائع کر دیا جائے گا -

پھر البلاغ نمبر ۱۳ و ۱۴ مورخہ ۲ و ۱۰ ، مارچ ۱۹۱۶ء میں البیان کی تاخیر کا ذکر ہے اور عفو کی خواستگاری کی گئی ہے - کیونکہ کاغذ کا قحط ہے - یہی حال ترجمان القرآن کا بھی ہے -

"آخر کار ۱۸ ، مارچ ۱۹۱۶ء کو گورنمنٹ بنگال نے کلکتہ سے اخراج کا حکم دے دیا اور مولانا رانچی چلے گئے - اس زمانے میں مولانا نے یہ مقدمہ چھپوایا تھا جس کے تئیس صفحات ہمیں کرم خوردہ حالت میں ملے ہیں" [۱]

خود مولانا آزاد تحریر فرماتے ہیں :

"البلاغ میں جب ترجمہ و تفسیر کی اشاعت کا اعلان کیا گیا ہے تو ترجمہ پانچ پاروں تک پہنچ چکا تھا - تفسیر سورۂ آل عمران تک مکمل ہو چکی تھی اور مقدمہ یادداشتوں کی شکل میں قلم بند تھا -" [۲]

کام کی جلد از جلد تکمیل کے لئے جو طریقۂ کار وضع کیا گیا اس کے بارے میں مولانا لکھتے ہیں :

"اس خیال سے کہ تھوڑے وقت کے اندر زیادہ سے زیادہ کام انجام پا جائے ، میں نے تصنیف کے ساتھ چھپائی کا سلسلہ بھی جاری کر دیا - میرا خیال تھا کہ اس طرح سال بھر کے اندر ترجمہ مکمل بھی ہو جائے گا اور چھپ بھی جائے گا - نیز تفسیر کی کم از کم پہلی جلد شائع ہو جائے گی - یہ سات دن کی مثنویت

---

[۱] محمد اجمل خاں - مقدمہ البیان کے بارہویں باب کا ایک حصہ ، ملحقہ ، ترجمان القرآن ، دہلی ، ساہتیہ اکادمی ۱۹۶۴ء ، ص ۳۴ - ۵۵۳

[۲] آزاد ، ابوالکلام : ترجمان القرآن ، اشاعت اول ، محولہ بالا ص ۵۹

میں نے یوں تقسیم کر دی تھی کہ تین دن البلاغ کی ترتیب میں صرف کرتا تھا۔ دو دن ترجمے میں اور دو دن تفسیر میں"۔ [1]

لیکن جب مولانا کو حدود بنگال سے باہر نکل جانے کا حکم دیا گیا تو کام کی موجودہ اور آئندہ صورت حال کے بارے میں مولانا کے عزائم یہ تھے۔

"۳، مارچ ۱۹۱۶ء کو جب میں کلکتہ سے روانہ ہوا تو تفسیر کے چھ فارم چھپ چکے تھے اور ترجمے کی کتابت شروع ہو رہی تھی۔ اب میں نے کوشش کی کہ میری عدم موجودگی میں پریس جاری رہے اور کم از کم تفسیر اور ترجمہ کا کام ہوتا رہے۔ چنانچہ جون ۱۹۱۶ء میں پریس کے دوبارہ اجرا کا انتظام ہو گیا اور میں مسودات کی ترتیب میں مشغول ہو گیا تاکہ پریس کے حوالے کر دوں"۔ [2]

لیکن اس حالت پر ابھی پورے چار ماہ بھی نہ گزرے تھے کہ ۸ جنوری ۱۹۱۶ء کو مولانا کی نظر بندی کے احکام جاری ہو گئے۔ اس کے ساتھ ہی وہ پورا نظام معطل ہو گیا جو ترجمہ و تفسیر کی اشاعت کے لئے قائم کیا گیا تھا اب مولانا کے لئے اس کے سوا کوئی چارہ کار نہ تھا کہ صرف تصنیف و تسوید کے کام پر قناعت کر لیں اور فراغت و کتابی و گوشہ چینے کے مصداق نظر بندی کی فرصت اور رانچی کے گوشۂ عزلت میں قرآن حکیم پر غور و فکر اور ترجمہ و تفسیر کی مشغولیت ہی میں اپنے قلب کے اطمینان اور دماغ کے عیش کو ڈھونڈھا جائے۔ لیکن وقت کا فیصلہ اب بھی ان کے عزائم کے خلاف تھا۔ نظر بندی کے احکام کی تعمیل کے ساتھ مولانا کی قیام گاہ کی تلاشی بھی لی گئی تھی اور افسران تفتیش نے دیگر کاغذات کے ساتھ ترجمہ و تفسیر کے مسودات بھی اپنے قبضے میں کر لئے لیکن جب ان میں کوئی قابل اعتراض چیز نہ ملی تو دو ہفتے کے بعد انہیں واپس کر دیا گیا لیکن جب تفتیش کے نتیجے سے حکومت ہند مطمئن نہ ہوئی تو اس نے از سر نو اس معاملے پر توجہ کی اور پہلے محکمہ تفتیش کا افسر اعلیٰ دو ہفتے تک کلکتہ میں مصروف تفتیش رہا، پھر رانچی پہنچا اور مولانا کی قیام گاہ کی دوبارہ تلاشی لی گئی اور تمام کاغذات، ترجمہ و تفسیر کے مسودات حتیٰ کہ چھپی ہوئی کتابیں بھی اپنے

[1] آزاد، ابوالکلام، ترجمان القرآن، (اشاعت اوّل) محولہ بالا، ص ۵۹، ۶۰
[2] ایضاً، ص ۶۰،

قبضے میں کریں - مولانا فرماتے ہیں -

"جس وقت یہ معاملہ پیش آیا ترجمہ کا مسودہ آٹھ پاروں تک اور تفسیر کا مسودہ سورۂ نساء تک پہنچ چکا تھا لیکن اب ان کا ایک ورق بھی میرے قبضے میں نہ تھا - تاہم میں نے نویں پارے سے ترجمہ کی ترتیب جاری رکھی اور ۱۹۱۸ء کے اواخر میں کام ختم کر دیا - اب اگر ابتداء کے آٹھ پاروں کا ترجمہ واپس مل جائے تو پورے قرآن کا ترجمہ مکمل تھا - ؎ۂ

مولانا نے کاغذات و مسودات کی واپسی کے لئے ہر چند کوشش کی لیکن کامیابی نہ ہوئی تو ابتدائی نو پاروں کا ترجمہ بھی دوبارہ کر لیا - ۲۷ر دسمبر ۱۹۱۹ء کو مولانا کو نظر بندی سے رہائی ملی - اب توقع کی جا سکتی تھی کہ شائقین ترجمہ و تفسیر کے ہاتھوں تک جلد یہ تالیفات پہنچ جائیں گی لیکن ٹھیک اس وقت ملک میں نئی سیاسی سرگرمیوں کا دروازہ کھل چکا تھا اور تحریک الہلال کے سیاسی پہلو کی کامیابی کا پورا مواد تیار تھا - صورت حال یہ تھی کہ مولانا آزاد اگر اپنے پیش نظر علمی و تصنیفی کاموں کی تکمیل کے لئے کسی گوشۂ تنہائی میں بیٹھنا بھی چاہتے تو ملک کے بیدار عوام اور رہنماؤں کے لئے انہیں نظر انداز کر دینا ممکن نہ تھا - چنانچہ مولانا کو ملک کی رہنمائی کے لئے میدان میں نکلنا پڑا یا وقت کے تقاضوں نے قوم و ملت کی رہنمائی کے لئے ان کے وجود سامی کو ڈھونڈ نکالا - لیکن ترجمہ و تفسیر کی اشاعت کی ضرورت بھی ایسی نہ تھی کہ مولانا اسے نظر انداز کر دیتے - چنانچہ اس دوران میں تسوید کتابت کا کام بھی برابر جاری رہا اور ۱۰ر دسمبر ۱۹۲۱ء کو مولانا کی گرفتاری کا واقعہ پیش آیا تو متن کی کتابت مکمل ہو چکی تھی اور ترجمہ کی کتابت کا آغاز تھا - لیکن اب جو حادثہ پیش آیا وہ مولانا کے بقول

"اس افسانے کی آخری المناکی ہے - اس کی وجہ سے نہ صرف ترجمان القرآن اور تفسیر کی اشاعت رک گئی بلکہ میری علمی زندگی کے ولولے افسردہ ہو گئے - "

گرفتاری کے بعد مولانا کے مکان اور مطبع کی تلاشی لی گئی اور افسران تفتیش قلمی مسودات کا تمام ذخیرہ اٹھالے گئے حتیٰ کہ ترجمان القرآن کی تمام لکھی ہوئی کاپیاں

؎ۂ ایضاً ص ۱۲

بھی توڑ مروڑ کو مسودات کے ڈھیر میں ملا دیں اور منفرق قلمی کاغذات کی رسید دے کر چلے گئے ۔ پندرہ ماہ کے بعد فروری ۱۹۲۳ء میں جب مولانا رہا ہوتے اور کاغذات کی واپسی کے لئے کوشش کی اور اس میں کامیابی ہوئی تو جو کچھ ہاتھ آیا وہ محض اوراق پریشاں کا ڈھیر تھا ۔ یہ مولانا کے صبر و شکیب کے لئے زندگی کی بہت بڑی آزمائش تھی ۔ اب ترجمہ و تفسیر کی ہستی اس کے سوا ممکن نہ تھی کہ از سر نو محنت کی جاتے ۔ لیکن مولانا فرماتے ہیں ۔

"اس حادثے کے بعد طبیعت کچھ اس طرح افسردہ ہوگئی کہ ہر چند کوشش کی مگر ساتھ نہ دے سکی ۔ میں نے محسوس کیا کہ حادثہ کا زخم اتنا ہلکا نہیں کہ فوراً مندمل ہو جائے ۔ ۔ ۔ ۔ کئی سال گزر گئے میں اپنے آپ کو اس کام کے لئے آمادہ نہ کر سکا ... لیکن ایک

ایسے کام کی طرف سے جس کی نسبت میرا یقین تھا کہ مسلمانوں کے لئے وقت کا سب سے زیادہ ضروری کام ہے، ممکن نہ تھا کہ زیادہ عرصے طبیعت غافل رہی، جس قدر وقت گزرتا جاتا تھا اس کام کی ضرورت کا احساس میرے لئے ناقابل برداشت ہوتا جاتا تھا ۔ میں محسوس کرتا تھا کہ اگر یہ کام مجھ سے انجام نہ پایا تو شاید عرصے تک اس کی انجام دہی کا کوئی سامان نہ ہو ۔

سنہ ۱۹۲۷ء کا قریب الاختتام تھا کہ اچانک مدتوں کی رکی ہوئی طبیعت میں جنبش ہوئی اور رشتہ کار کی جو گرہ ذہن و دماغ کی پیہم کوششیں نہ کھول سکی تھیں، دل کے جوشش بے اختیار سے خود بخود کھل گئی کام شروع کیا تو ابتدا میں چند دنوں تک طبیعت رکی رکی رہی لیکن جوں ہی ذوق و فکر کے دو چار جام گردش میں آئے، طبیعت کی ساری رکاوٹیں دور ہوگئیں اور پھر تو ایسا معلوم ہونے لگا گویا اس شورش کدۂ مستی میں کبھی افسردگی اور خمار آلودگی کا گزر ہی نہیں ہوا تھا ۔

بہ بدمستی ہرزہ گو متہم ساز و مرا ساقی

ہنوز از بادۂ دوشینہ ام پیمانہ بود ارد

.... بہر حال کام شروع ہو گیا اس خیال سے کہ سورۂ فاتحہ کی تفسیر ترجمہ کے لئے کبھی ضروری تھی سب سے پہلے اس کی طرف متوجہ ہوا ۔ پھر

ترجمہ کی ترتیب شروع ہوئی۔ حالات اب بھی موافق نہ تھے، صحت روز بروز کمزور ہو رہی تھی۔ سیاسی مشغولیت کی آلودگیاں بدستور خلل انداز تھیں تاہم کام کا سلسلہ کم و بیش جاری رہا اور ۲۰ جولائی ۱۹۳۰ء کو آخری سورت کے ترجمہ و ترتیب سے فارغ ہو گیا۔

تا دست رسم بود زدم چاکِ گریباں
شرمندگی از خرقۂ پشمینہ ندارم،، لہ

مقدمہ تفسیر البصائر جیسا کہ اوپر اشارہ کیا جا چکا ہے کہ مولانا کے نزدیک قرآن کے درس و مطالعہ کی تین مختلف ضرورتیں تھیں اور مولانا نے ان تینوں ضرورتوں کو تین کتابوں میں تقسیم کر دیا تھا۔ مقدمہ تفسیر، البیان، اور ترجمان القرآن، مقدمہ تفسیر قرآن کے مطالب پر اصولی مباحث کا مجموعہ تھا اور مقصد یہ تھا کہ مطالب قرآن کے جوامع و کلیات مدون ہو جائیں البلاغ میں اس کے بارے میں مولانا نے لکھا تھا۔

"تفسیر کے علاوہ ایک اور اہم اور مستقل چیز تفسیر کا مقدمہ ہے۔ ان شاء اللہ اس کے ابتدائی اجزا بھی البیان کی اولین اشاعت کے ساتھ شائع ہو جائیں گے اور پھر اصل تفسیر کے ساتھ چھپتے رہیں گے امید ہے کہ مقدمہ جلد مرتب ہو جائے گا کیوں کہ وہ ایک محدود چیز ہے" ؎

بعض حضرات نے اس قسم کے اعلان اور حوالوں کو شک و شبہ کی نظر سے دیکھا تھا اور خیال کیا تھا کہ مقدمہ تفسیر کبھی مولانا کے دماغ سے کاغذ پر منتقل نہیں ہوا لیکن اب مقدمہ کے بارھویں باب کے کچھ مطبوعہ اوراق کی دستیابی نے مولانا کے بیان پر مہر تصدیق ثبت کر دی ہے۔ مقدمہ کے بارہ ابواب خواہ کتنے ہی مختصر تصور کر لئے جائیں اس کے صفحات کی تعداد سینکڑوں تک جا پہنچتی ہے تذکرہ کے ایک مقام پر تو اس کے اکیسویں باب کا حوالہ آیا ہے۔ اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اس کے اکیس ابواب تو ضرور تھے، مولانا لکھتے ہیں!

لہ آزاد، ابوالکلام، ترجمان القرآن، اشاعت اول، محولہ بالا ص ۶۳، ۶۴

؎ محمد اجمل خاں مقدمہ البیان کے بارھویں باب کا ایک حصہ محولہ بالا ص ۵۴ - ۵۵

"شرحِ حقیقتِ تحریف شریعت علی الخصوص فتنتین عظیمتین یونانیہ وعجمیہ کے لئے مقدمہ تفسیر باب بست ویکم اور تفسیر فاتحۃ الکتاب کو دیکھنا چاہیئے"۔ [1]

مقدمہ تفسیر کے لئے مولانا نے "البصائر" نام تجویز کیا تھا۔

البیان فی مقاصد القرآن

تفسیر البیان کا مقصد تالیف زیادہ وسیع دائرے میں نظر و مطالعہ تھا، مقدمہ خاص اہل علم و نظر کے مطالعے کے لئے تھا اور تفسیر وسیع مطالعہ کے شائقین کے لئے تھی۔ لیکن مولانا نے بعد میں اس کی الگ اشاعت کا فیصلہ ترک کر دیا تھا اور یہ طے کیا تھا کہ تفسیر کے مباحث کو بھی ترجمان القرآن ہی میں شامل کر دیا جائے۔ البتہ جو جو مباحث ترجمان القرآن کی گنجائش سے زیادہ ہوں انہیں الگ چھاپ دیا جائے۔ مولانا نے لکھا ہے۔

"تفسیر البیان کے لئے پچھلی ترتیب میں نے اب ترک کر دی ہے۔ کیوں کہ میں محسوس کرتا ہوں کہ مسلسل تفسیر کا قدیم طریقہ موجودہ زمانے میں عام مطالعے کے لئے موزوں نہیں ہے۔ ایک غیر مرتب اور غیر منقسم سلسلے کی غیر معمولی درازی اکثر طبائع پر شاق گزرتی ہے۔ اب میں چاہتا ہوں تفسیر اس صورت میں مرتب ہو جائے کہ اسی ترجمان القرآن کے ہر ترجمۂ سورت پر ایک مقدمہ یا دیباچہ کا اضافہ کر دیا جائے۔ ترجمہ کی وضاحت پہلے سے موجود ہے۔ نوٹوں کی تشریحات جا بجا روشنی ڈال ہی رہی ہیں ضرورت صرف ایک مزید درجہ بحث و نظر کی ہے۔ وہ ہر سورت کے دیباچے سے پوری ہو جائے گی اور بحیثیت مجموعی تفسیر کے مطالب اس طرح مرتب اور منقسم رہیں گے کہ ایک مسلسل تفسیر کا انتشارِ مطالب محسوس نہیں ہوگا۔

جولائی ۱۹۳۰ء میں "ترجمان القرآن" کی تسوید سے فارغ ہو کر مولانا آزاد مذکورۃ الصدر منصوبے کے مطابق تفسیر کی تیاری میں مصروف ہو گئے تھے۔ ۱۹۳۲ء کے اواخر میں ترجمان القرآن کی پہلی جلد شائع ہوئی تھی اور ۱۹۳۶ء میں دوسری جلد شائع ہوئی تو اس کی ترتیب پہلی جلد کے انداز سے بالکل مختلف تھی البتہ اس فیصلے میں بھی

[1] آزاد، ابوالکلام، تذکرہ، کلکتہ، الہلال پریس)

اتنی تبدیلی کر دی گئی کہ سورہ کے تفسیری مباحث کو ترجمۂ سورت پر ایک مقدمہ یا دیباچہ کا اضافہ کر دیا جائے لیکن عملاً یہ صورت اختیار کی گئی کہ سورۃ کے اہم مقامات پر سورۃ کے آخر میں تفسیری مباحث کا اضافہ کر دیا گیا۔ اس طرح کہ سورت کا کوئی اہم مقام تشنۂ بحث و نظر نہ رہا۔

ترجمان القرآن ترجمان القرآن درس و مطالعۂ قرآن کی ضرورتوں میں آخری چیز تھی لیکن اپنے مقصد و نوعیت میں وہ سب سے زیادہ ضروری، اہم اور بقول مولانا کے "تفسیر و مقدمہ کے لئے بھی اصل بنیاد یہی ہے" اس لئے سب سے پہلے اس کی اشاعت کا فیصلہ کیا گیا۔ اس کے مقصد تالیف کے بارے میں مولانا لکھتے ہیں :-

"اس کی ترتیب سے مقصود یہ ہے کہ مطالب قرآنی کے فہم و تدبر کے لئے ایک ایسی کتاب تیار ہو جائے جس میں کتب تفسیر کی سی تفصیلات تو نہ ہوں لیکن وہ سب کچھ ہو جو قرآن کو ٹھیک ٹھیک سمجھ لینے کے لئے ضروری ہے اس غرض سے جو اسلوب اختیار کیا گیا ہے، اُمید ہے کہ اہل نظر اس کی موزونیت بہ یک نظر محسوس کر لیں گے۔ پہلے کوشش کی ہے کہ قرآن کا ترجمہ اُردو میں اس طرح مرتب ہو جائے کہ اپنی وضاحت میں کسی دوسری چیز کا محتاج نہ رہے۔ اپنی تشریحات خود اپنے ساتھ رکھتا ہو۔ پھر جا بجا نوٹوں کا اضافہ کیا ہے، جو سورت کے مطالب کی رفتار کے ساتھ ساتھ برابر چلے جاتے ہیں، اور جہاں کہیں ضرورت دیکھتے ہیں، مزید رہنمائی کے لئے نمودار ہو جاتے ہیں۔ یہ قدم قدم پر مطالب کی تفسیر کرتے ہیں، اجمال کو تفصیل کا رنگ دیتے ہیں، مقاصد و وجوہ سے پردے اُٹھاتے ہیں، دلائل و شواہد کو روشنی میں لاتے ہیں، احکام و نواہی کو مرتب و منضبط کرتے ہیں، اور زیادہ سے زیادہ مختصر لفظوں میں، زیادہ سے زیادہ معانی و معارف کا سرمایہ فراہم کرتے جاتے ہیں۔ یہ گویا قاری قرآن کے لئے تفکر و تدبر کی روشنی ہے، جو بحکم نورھم یسعی بین ایدیھم و بایمانھم (۵۷ : ۱۲) اس کے ساتھ چلتی رہتی ہے، اور کہیں بھی اُس کا ساتھ نہیں چھوڑتی!"

آگے چل کر لکھتے ہیں

"یہ حقیقت پیش نظر ہے کہ ترجمان القرآن کے نوٹ تشریح و وضاحت کا ایک مزید درجہ ہیں، ورنہ قرآن کا صاف صاف مطالب سمجھ لینے کیلئے متن کا ترجمہ پوری طرح کفایت کرتا ہے۔"

اس کے بعد ان نوٹس کی اہمیت پر مزید روشنی ڈالتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں :

"نوٹس کی ترتیب کا معاملہ نفس ترجمہ سے کم مشکل نہ تھا۔ یہ ظاہر ہے کہ ان کے لئے ایک محدود مقدار سے زیادہ جگہ نکل نہیں سکتی تھی، اور نوٹ، نوٹ نہ رہتے اگر ایک خاص مقدار سے کمیت یا تعداد میں زیادہ ہو جاتے۔ لیکن ساتھ ہی ضروری تھا کہ کوئی ضروری مقام تشنہ نہ رہ جائے، اور مقاصد و مطالب قرآنی کی تمام مہمات واضح ہو جائیں۔ پس پوری احتیاط کے ساتھ ایسا طریق بیان اختیار کیا گیا کہ لفظ کم سے کم ہیں، لیکن اشارات زیادہ سے زیادہ سمیٹ لئے گئے ہیں۔ جس چیز کی لوگ کمی پائیں گے وہ صرف مطالب کا پھیلاؤ ہے۔ نفس مطالب میں کوئی کمی محسوس نہ ہوگی۔ اُن کے ہر لفظ اور ہر جملہ پر جس قدر غور کیا جائے گا مطالب و مباحث کے نئے نئے دفتر کھلتے جائیں گے۔"

اس کے بعد اصول ترجمہ و تفسیر کی بحث کے آخر میں پورے سلسلے کے بارے میں ان الفاظ میں اظہار خیالات فرماتے ہیں۔

"آخر میں چند الفاظ اس پورے سلسلۂ ترجمہ و تفسیر کی نسبت کہہ دینا ضروری ہیں۔ کامل ستائیس۲۷ برس سے قرآن میرے شب و روز کے فکر و نظر کا موضوع رہا ہے۔ اُس کی ایک ایک سورت، ایک ایک مقام، ایک ایک آیت، ایک ایک لفظ پر میں نے وادیاں قطع کی ہیں، اور مرحلوں پر مرحلے طے کئے ہیں۔ تفاسیر و کتب کا جتنا مطبوعہ و غیر مطبوعہ ذخیرہ موجود ہے میں کہہ سکتا ہوں کہ اُس کا بڑا حصہ میری نظر سے گزر چکا ہے، اور علوم قرآن کے مباحث و مقالات کا کوئی گوشہ نہیں جس کی طرف سے ذہن نے تغافل اور جستجو نے تساہل کیا ہو۔ علم و نظر کی راہوں میں آجکل قدیم و جدید کی تقسیمیں کی جاتی ہیں، لیکن میرے لئے یہ تقسیمیں بھی کوئی تقسیم نہیں۔ جو کچھ قدیم ہے، وہ مجھے ورثہ میں ملا، اور جو کچھ جدید ہے اُس کے لئے اپنی راہیں آپ نکالی ہیں۔ میرے لئے وقت کی جدید راہیں بھی ویسی ہی دیکھی بھالی ہیں جس طرح قدیم راہوں کے چپے چپے کا شناسا ہوں :

رہا ہوں رند بھی ہیں اور پارسا بھی ہیں
مری نظر میں ہیں رندان و پارسا کا ایک!

خاندان، تعلیم، اور سوسائٹی کے اثرات نے جو کچھ میرے حوالے کیا تھا، میں نے اوّل دن ہی اُس پر قناعت کرنے سے انکار کر دیا، اور تقلید کی بندشیں کسی گوشہ میں بھی روک نہ ہو سکیں، اور تحقیق کی تشنگی نے کسی میدان میں بھی ساتھ نہ چھوڑا:

ہیچ گہ ذوقِ طلب از جستجو بازم نداشت
دانہ می چیدم دراں روزے کہ خرمن داشتم!

میرے دل کا کوئی یقین ایسا نہیں ہے جس میں شک کے سارے کانٹے نہ چبھ چکے ہوں، اور میری رُوح کا کوئی اعتقاد ایسا نہیں ہے جو انکار کی ساری آزمائشوں میں سے نہ گزر چکا ہو، میں نے زہر کے گھونٹ بھی ہر جام سے پیے ہیں، اور تریاق کے نسخے بھی ہر دار الشفا کے آزمائے ہیں۔ میں جب پیاسا تھا، تو میری لب تشنگیاں دوسروں کی طرح نہ تھیں، اور جب سیراب ہوا، تو میری سیرابی کا سرچشمہ بھی شاہراہِ عام پر نہ تھا:

رلے کہ خضر واشت، ز سرچشمہ دور بود
لب تشنگی ز راہ گزر بردہ ایم ما!

اس تمام عرصے کی جستجو و طلب کے بعد، قرآن کو جیسا کچھ اور جتنا کچھ سمجھ سکا ہوں، میں نے ان تین کتابوں کے صفحوں پر پھیلا دیا ہے: ترجمان القرآن، البیان، مقدمۂ تفسیر:

سبک زجائے نگری، کہ بس گراں گہرست
متاعِ من کہ نصیبش مباد ارزانی!

آخر میں مولانا نے اپنے اس یقین کا اظہار کیا ہے:

میرا یقین ہے کہ مسلمانوں کی زندگی و سعادت کے لئے چشمۂ حیات، حقیقت قرآنی کا انبعاث ہے، اور میں نے کوشش کی ہے کہ

اُس کے فہم و بصیرت کا دروازہ اُن پر کھلجائے۔

میں ترجمان القرآن شائع کرتے ہوئے محسوس کرتا ہوں کہ اس بارے میں جو کچھ میرا فرض تھا، توفیق الٰہی کی دستیاری سے میں نے ادا کر دیا۔ اب اس کے بعد جو کچھ ہے، وہ مسلمانوں کا فرض ہے، اور یہ اللہ کے ہاتھ ہے کہ اُنہیں ادائے فرض کی توفیق دے:

حدیثِ عشق و سرمستی زمن لبشنو نہ از واعظ
کہ باجام وسبو ہر شب قرینِ ماہ و پروینم!

ما کان حدیثاً یُفتریٰ ولکن تصدیق الذی بین یدیہ
وتفصیل کل شیءٍ وھدیً ورحمۃً لقومٍ یومنونَ (۱۲:۱۱۱)

۱۹۳۰ء کے آخر تک قرآن حکیم کی تعلیم و اشاعت کے باب میں مولانا ابوالکلام آزاد کے یہ افکار و مساعی تھے - پہلی جلد کی اشاعت کے بعد وہ دوسری جلد کی اشاعت کے سر و سامان میں مصروف ہو گئے جو ۱۹۳۶ء میں شائع ہوئی - دوسری جلد کی اشاعت کے بعد بھی مولانا وقت کی اس سب سے بڑی ضرورت سے غافل نہیں ہوتے وہ آئندہ اور آخری جلد کی تیاری اور پہلی دو جلدوں کی دوسری اشاعتوں کے سر و سامان مصروف ہو گئے - متعدد حضرات کے نام مولانا کے خطوط سے مولانا کے ذوق و مصروفیت کے اس پہلو پر روشنی پڑتی ہے اور تیسری جلد کے مسودے میں سے جس کے بارے میں مولانا مرحوم کے انتقال کے بعد ہمیں بتایا گیا تھا کہ انہوں نے اسے مرتب ہی نہیں کیا تھا، سورۂ نور کا ترجمہ و تفسیر دستیاب بھی ہو گئی ہے -

مولانا آزاد کی علمی زندگی کا ایک تیسرا مانع مولانا کی سیاسی مصروفیات تھیں اور یہ دور جو ۱۹۳۵ء کے بعد خصوصاً ۱۹۳۷ء کے انتخابات کے بعد ملک کی تاریخ میں شروع ہوا تھا سب سے ہنگامی دور تھا - انتخابات میں تمام صوبوں میں بہت بڑے پیمانے پر کانگریس کی کامیابی، وزارتوں کا قیام، مسلم اقلیت کے صوبوں میں مسلمانوں کی عام ناراضگی، بے چینی، جنگِ عظیم دوم کا آغاز، برٹش حکومت کی پالیسی، کانگریسی وزارتوں کا استعفاء، مسلم لیگ کا اجلاس لاہور، پاکستان کی قرارداد اور ایک نئی سیاسی حرکت و عمل کے آغاز سے لے کر کانگریس کی ہندوستان چھوڑ دو تحریک، اور پھر ۱۹۴۲ء میں کانگریس کے رہنماؤں کی گرفتاری تک کا دور تاریخ پاک و ہند کا سب سے زیادہ ہنگامہ خیز اور پُر ہیجان دور تھا اس زمانے میں مولانا کی علمی اور تصنیفی سرگرمیاں بہت کم نظر آتی ہیں لیکن اگست ۱۹۴۲ء میں گرفتاری عمل میں آتی ہے اور قلعہ احمد نگر کا گوشۂ خلوت میسر آتا ہے تو مولانا پھر

قرطاس و قلم کی صعبتوں میں کھو جاتے ہیں اور جب تین سال کی قید کے بعد باہر آتے ہیں تو ترجمان القرآن کی دونوں جلدیں نظر ثانی کے بعد متعدد اہم اضافوں اور تشریحوں سے مزین جدید اشاعت کے لئے ساتھ لاتے ہیں۔ نظر ثانی کے کام سے وہ ۱۹۴۵ء کے بالکل شروع میں فارغ ہو چکے تھے اور ۱۷ فروری کو دیباچہ طبع ثانی لکھ کر فارغ ہو گئے تھے اگرچہ یہ دیباچہ جلد اول میں شامل ہے لیکن نظر ثانی کا کام چونکہ دونوں جلدوں میں ہوا تھا اس لئے اسے دونوں جلدوں پر سمجھنا چاہیئے۔

مولانا ابوالکلام آزاد کی زندگی کے آخری چند برسوں میں جب کہ انکی صحت نے جواب دے دیا تھا اور حوادث و واقعات نے انہیں حد درجہ افسردہ خاطر کر دیا تھا۔ تصنیف و تالیف کی مصروفیات ختم اور علمی زندگی صرف مطالعے کی حد تک محدود ہو گئی تھی تب بھی قرآن حکیم سے ان کے والہانہ شغف اور ذوق میں کوئی فرق نہ پڑا تھا۔ اس کا اندازہ مولانا سعید احمد اکبر آبادی کے اس بیان سے کیا جا سکتا ہے۔

> "مولانا ابوالکلام آزاد کی پرائیویٹ زندگی حد درجہ پراسرار تھی۔ وہ ملاقات کے لئے ڈرائینگ روم میں آجاتے تھے ورنہ اپنے کمرے میں بند رہتے تھے۔ جہاں بڑے سے بڑا ان کا دوست بھی نہیں جا سکتا تھا۔ بعض معتبر راویوں سے معلوم ہوا ہے کہ مولانا اپنے کمرے میں زیادہ تر وقت مطالعہ میں صرف کرتے تھے۔ قرآن مجید سے ان کو بڑا شغف تھا۔ وقت بے وقت اس کو اٹھا لیا اور جھوم جھوم کر پڑھنا شروع کر دیا۔ بسا اوقات ایک ہی آیت کو بار بار پڑھتے اور ہر مرتبہ آواز کے ساتھ ان کی وضع نشست بدل جاتی تھی۔ عبادت کے معاملے میں خصوصاً بہت زیادہ اخفا سے کام لیتے تھے"[1]

اس سلسلے کی ایک اہم شہادت مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی کی ہے۔ وہ فرماتے ہیں:

---

[1] سعید احمد اکبر آبادی، مولانا ابوالکلام کی مذہبی زندگی (ایک خط) لکھنؤ صدق جدید، ۱۱ دسمبر ۱۹۵۹ء ص ۵۔

"حقیقتاً حضرت مولانا کو جن لوگوں نے قریب سے دیکھا ہے وہ بخوبی جانتے ہیں کہ اگرچہ وقت کے تقاضوں اور اجتماعی ہنگامی زندگی نے ان کو مسلسل تحریک استخلاص وطن اور پھر آزادی کے بعد وطن عزیز کی تعمیر اور مسلمانوں کے مستقبل کی فکر نے بے حد مصروف و منہمک رکھا۔ پھر بھی حضرت مرحوم کی زندگی میں ایک دن بھی ایسا نہیں گزرا کہ سکون شب و سعادت اوّلین کی وہ گھڑیاں جب کہ دُنیا بستر راحت پر خواب نوشیں کے مزے لوٹتی ہے، رجوع انابت الی اللہ اور مراقبہ و عبادت میں گزری ہوں۔ ان کا معمول تھا کہ رات کو بہت جلد (عموماً نو بجے) سو جاتے تھے اور صبح گاہی ۳۔ ۳½ بجے روزانہ ہی بیدار ہوتے اور اول چار رکعت سے آٹھ رکعت تک خدا کے حضور میں سر بسجود و جبین بہ نیاز رہنے کے بعد خود اپنے شوقِ چائے سے فارغ ہوتے اور پھر تفسیر قرآن حکیم یا آیات الٰہی کے کسی عنوان پر غور و فکر میں صبح کی نماز تک مشغول رہتے اور نماز فجر پڑھ کر اپنے دنیوی مشاغل میں مصروف ہو جاتے۔" [1]

لیکن اس سلسلے میں ایک شہادت ایسی بھی ہے جسے آپ مشاہدے کی آنکھ سے دیکھ سکتے ہیں۔ یہ مولانا آزاد کے پرائیویٹ سیکرٹری محمد اجمل خاں کی شہادت ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مولانا کا قرآن پر غور و فکر، ترجمہ و تفسیر پر نظر ثانی اور ترمیم و اضافہ کا سلسلہ مولانا کی وفات (فروری ۱۹۵۸ء) تک جاری رہا۔ خانصاحب لکھتے ہیں!

"ترجمان القرآن جلد دوم پر بھی اسی زمانے میں نظر ثانی کی اور اس میں بھی جابجا ترمیمیں اور اضافے کئے۔ وفات کے زمانے تک اس جلد میں کمی بیشی کرتے رہے۔ حتی کہ اس میں سے "کوروش کبیر" کا مفصل ذکر عربی رسالہ "ثقافۃ الہند" میں "ذوالقرنین" کے عنوان سے چھپا۔ اس جلد میں نہایت اہم ترمیمیں ہیں۔ بعض کا تعلق جلد اول سے بھی ہے۔" [2]

اس قسم کی ترمیمات و اضافہ جات میں سے محمد اجمل خاں نے چار اہم اضافے بطور نمونہ جلد اول کی آخری اشاعت پر استدراک میں بھی شامل کر دیے ہیں۔

---

[1] حفظ الرحمٰن سیوہاروی، مولانا! ایک سانحۂ عظیم، دہلی: الجمعیۃ آزاد نمبر، ۴ دسمبر ۱۹۵۸ء، ص ۵۵

[2] محمد اجمل خان، استدراک بر ترجمان القرآن جلد اوّل، محولہ بالا، ص ۵۴۷

مولانا آزاد کی خدمت قرآن کے باب میں ایک اہم سوال باقی رہ گیا کہ آیا وہ ترجمان القرآن کی اشاعت کے بعد مطمئن ہو گئے تھے اور سمجھ لیا تھا کہ مسلمانوں کی زندگی کی اصلاح کے لئے قرآن حکیم کی اشاعت اور علم و عمل کا سب سے بڑا کام انجام پا گیا ؟

مجھے یہ کہنے کی اجازت دیجئے ترجمان القرآن کی اشاعت بلاشبہ وقت کا ایک بہت بڑا کام تھا لیکن یہ کام کی تکمیل نہیں، آغاز تھا مسلمانوں کی زندگی میں انقلاب و اصلاح کے کامل ظہور کے لئے قرآن حکیم کی تعلیم و اشاعت کا مولانا کے سامنے ایک بہت بڑا اور وسیع منصوبہ تھا۔ اور اس کے لئے انہوں نے پورا نقشہ کار بھی بنا دیا تھا۔ لیکن اس کے تذکرہ کے لئے اس صحبت کی زیادہ سے زیادہ فرصت جو اس خاکسار کے حصے میں آسکتی تھی وہ اپنی انتہا کو پہنچ کر اس حکایت لذیذ و دلچسپ کو ختم کر دینے کا اشارہ کر رہی ہے۔

سو دا خدا کے واسطے کر قصہ مختصر
اپنی تو نیند اڑ گئی تیرے فسانے سے

قرآن حکیم کی تعلیم و اشاعت کے ایک علمی ادارے اور حالات و وقت کے تقاضوں کے مطابق تصنیف و تالیف کے مختلف کاموں کی ضرورت اور اس راہ کی شرائط پر گفتگو کے لئے دوسری صحبت کا انتظار کرنا چاہیئے۔

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین۔

قرآن کا تصورِ علم اور اسکی اہمیت

از قلم: ڈاکٹر ابصار احمد

اسلام وہ عظیم الشان نظام حیات ہے جس نے علم کی قدر و قیمت کو تسلیم کیا اور اسے بے حد اہمیت بخشی - ترتیب نزول کے اعتبار سے وحی کی پہلی آیت "اقرء باسم ربک الذی خلق" پڑھنے کے حکم سے علم و دانش اور تعلیم و تعلم کے ضمن میں انسان کی اس استعداد پر دلالت کرتی ہے جس سے اشرف المخلوقات کو خالق کائنات نے بطور خاص بہرہ ور کیا ہے - چونکہ فہم و ادراک اور علم و دانائی کا حصول انسانی زندگی کے اغراض و مقاصد میں سب سے بنیادی ہے اسی لئے حق تعالےٰ نے اسے مشاہدہ اور استنباط کی صلاحیتوں سے نوازا ہے - قرآن نے جہاں آدم کے مسجودِ ملائکہ ہونے کا ذکر کیا وہاں اسکی وجہ یہ بتائی، وَعَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ كُلَّهَا (اور اس نے آدم کو سب نام سکھائے) قرآن کی متعدد آیات سے ثابت ہوتا ہے کہ اسلام کے نزدیک علم انسانیت کا شرف، قیادت کا سبب اور تسخیر ارض و سماء کا ذریعہ ہے - حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی علم کے متعلق فرمایا: طلب العلم فریضۃ علیٰ کل مسلم و مسلمۃ (طلب علم ہر مسلمان مرد اور عورت کا فرض ہے) ایک اور ارشاد میں صاحبان علم کو ورثۃ الانبیاء قرار دیا - چنانچہ یہی وجہ تھی کہ عرب جہاں علامہ بلاذری کی تحقیق کے مطابق صرف سترہ آدمی ایسے تھے جو لکھنا پڑھنا جانتے تھے، اسلام کی آمد کے بعد علم و حکمت کا سرچشمہ بن گیا جس نے پوری دنیا کو علوم و فنون سے سیراب کیا -

قرآن کریم نے واضح الفاظ میں فرمایا ہے کہ اللہ تعالےٰ نے کائنات تمہارے

لئے مسخر کردی ہے - وَسَخَّرَ لَكُمْ مَا فِي الْأَرْضِ جَمِيعًا (جو کچھ زمین میں ہے، وہ تمہارے لئے مسخر کیا ہے) دوسری جگہ ارشاد ہے - أَلَمْ تَرَوْا أَنَّ اللَّهَ سَخَّرَ لَكُمْ مَا فِي السَّمَاوَاتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ وَأَسْبَغَ عَلَيْكُمْ نِعَمَهُ ظَاهِرَةً وَبَاطِنَةً (لقمان - ۲۰) کیا تم نہیں دیکھتے کہ اللہ تعالیٰ نے تمہارے لئے زمین و آسمان کی تمام چیزوں کو مسخر کر دیا ہے اور تم پر اپنی ظاہری اور باطنی نعمتیں پوری کر رکھی ہیں - ان آیات کے علاوہ بہت سی دوسری آیات میں بار بار تدبر اور تفکر پر زور دیا گیا ہے - اور تقریباً ۷۵۶ آیات میں اس مضمون کی تاکید کی گئی ہے - اور انسان کو حکم دیا گیا ہے کہ کائنات کا بغور مطالعہ کرے - بعض مقامات پر ہواؤں کے چلنے، بادلوں کے برسنے، پرندوں کے اڑنے، دانے کی بار آوری، دن اور رات کے الٹ پھیر اور دوسرے فطری امور کے مشاہدے کی ترغیب دی گئی ہے - اور ذکر و فکر کی صلاحیت کو اولوالالباب (عقل والوں) کی ایک صفت قرار دیا گیا ہے - یہاں تک کہ جو لوگ غور و فکر سے کام نہیں لیتے ان کو چوپایوں سے تشبیہ دی گئی - بلکہ ان سے بھی بدتر قرار دیا گیا ہے — بَلْ هُمْ أَضَلُّ - چونکہ سائنسی تحقیقات، طبعی قوانین کے علم اور کائنات کے مشاہدے پر مبنی ہوتی ہیں اس لئے غور و فکر اور مشاہدے کی تاکید کر کے گویا اسلام نے سائنسی تحقیقات کی راہ ہموار کر دی -

علم اور حق KNOWLEDGE AND TRUTH

اسلام دین فطرت ہے - یعنی اسکی تمام تعلیمات حقائق اور امور واقعہ پر مبنی ہیں نہ کہ اوہام و خرافات اور دور از کار قیاسات پر - اور ساتھ ہی وہ ایک ایسا جامع اور عالمگیر نظام زندگی ہے جسکا تعلق ایک طرف ذات باری تعالیٰ اور عالم مابعد الطبیعیات سے ہے اور دوسری جانب کائنات اور عالم ارضی و سماوی سے ہے اور چونکہ انسان کا کوئی فکر، کوئی نظریہ اور عقیدہ اور کوئی عمل اور فعل علم کے بغیر استوار اور درست نہیں ہو سکتا اس بنا پر اسلام میں اہمیت کے اعتبار سے علم کو سرفہرست رکھا گیا ہے - اور بار بار مختلف اسالیب بیان

کے ذریعے اس کی افادیت اور ضرورت کو ذہن نشین کرنے کی کوشش کی گئی ہے ۔ پروفیسر F. Rosenthal نے اپنی کتاب (Knowledge Triumphant) میں بالکل صحیح لکھا ہے ۔

"علم ایک ایسا تصوّر ہے جو اسلام پر ہمیشہ چھایا رہا ہے ۔ اور اس نے مسلمانوں کی تہذیب وثقافت کو ایک خاص شکل وصورت دی ہے بلکہ حقیقت یہ ہے کہ علم کے تصوّر نے مسلمانوں کی تہذیب کو ہمہ جہتی طور پر وسعت وقوت سے متاثر کیا ہے ۔"

واقعہ یہ ہے جیسا کہ پروفیسر مذکور نے اپنی کتاب کے پانچویں باب (صفحہ ۷۰) کا عنوان "علم ہی اسلام ہے" مقرر کیا ہے ۔ قرآن میں اسلام اور دین کے لئے متعدد مواقع پر "حق" (یعنی سچائی یا Truth) کا لفظ استعمال کیا گیا ہے ۔ اور اسی طرح قرآن میں متعدد مقامات پر علم بمعنی حق وسچائی مستعمل ہوا ہے ۔ اس سے لامحالہ یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ از روئے قرآن علم اور اسلام دونوں ایک ہی جڑ کی دو شاخیں ہیں اور دونوں میں بہت قریبی نسبت ہے ۔

اسلام میں علم کی اہمیت کا ثبوت اس سے بڑھ کر اور کیا ہو سکتا ہے کہ قرآن مجید میں سورۃ البقرہ میں تخلیق آدم کا جو واقعہ بیان کیا گیا ہے ۔ اس میں صاف مذکور ہے کہ جب فرشتوں نے آدم کے بالمقابل خلافت الٰہی کے لئے اپنے استحقاق اور تسبیح وتقدیس خداوندی میں ہمیشہ مشغول رہنے کے باعث آدم پر اپنی فضیلت وبرتری کا دعویٰ کیا تو اللہ تعالےٰ نے جواباً فرمایا کہ اچھا اگر ایسا ہے تو تم کائنات عالم کے حقائق اشیاء بیان کرو فرشتوں نے اپنی لاعلمی کا اظہار کیا تو پھر اللہ تعالےٰ نے یہی سوال آدم سے کیا اور آدم نے تمام حقائق اشیاء بیان کر دیئے ۔ اب فرشتوں کو اپنی غلطی کا احساس ہوا اور بارگاہ الٰہی میں معذرت خواہ ہوئے ۔ اس قصہ سے صاف معلوم ہوا کہ آدم یعنی انسانوں کو فرشتوں پر جو تفوق وبرتری حاصل ہے اسکی اساس وبنیاد بجز علم اشیاء کے کچھ اور نہیں ہے ۔

قاضی بیضاوی کہتے ہیں کہ ان آیات سے جہاں یہ ثابت ہوا کہ انسان (بحیثیت مجموعی) فرشتوں سے افضل ہے، ساتھ ہی یہ ثابت ہو گیا کہ علم کو عبادت پر فضیلت و برتری حاصل ہے۔ اس کی تائید اس ارشاد نبوی سے بھی ہوتی ہے جس کے مطابق عالم کو عابد پر وہی فضیلت ہے جو بدر کامل کو ستاروں پر ہے۔ علماء پیغمبروں کے وارث ہوتے ہیں۔ یعنی جب دنیا سے رخصت ہوتے ہیں تو روپیہ پیسہ بطور ترکہ نہیں چھوڑتے، بلکہ ان کا ترکہ علم ہوتا ہے اور علماء اس کے وارث ہوتے ہیں۔ اسلامی نظریہ حیات میں علم کی اہمیت کا اندازہ اس سے بھی ہو سکتا ہے کہ امام بخاریؒ نے کتاب الایمان کے فوراً بعد کتاب العلم کو رکھا ہے۔

علم سے جو عظیم ترین معنوی اور روحانی فوائد حاصل ہوتے ہیں مندرجہ ذیل آیات میں ان کی نشاندہی کی گئی ہے۔ ارشاد ہوا۔

(۱) اِنَّمَا يَخْشَى اللّٰهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمٰٓؤُا (سورۃ الفاطر) — اللہ کے بندوں سے درحقیقت علماء ہی اللہ سے ڈرتے ہیں

یہاں یہ نکتہ ملحوظ خاطر رہے کہ عربی میں خوف کے معنی بھی ڈر ہیں لیکن اس کے لیے علم ضروری نہیں۔ اس کے برخلاف خشیہ اس ڈر کو کہتے ہیں جس کا محرک علم ہو۔ یعنی چونکہ علماء اللہ تعالیٰ کی ذات وصفات اور آثار قدرت یعنی کائنات عالم کا علم رکھتے ہیں اس بنا پر فی الحقیقت صرف وہی اللہ سے ڈرتے ہیں۔

(۲) وَمَا يَعْقِلُهَآ اِلَّا الْعٰلِمُوْنَ — (اور اللہ کی ان نشانیوں کو ارباب علم کے سوا کوئی اور نہیں سمجھتا۔)

(۳) وَقَالُوْا لَوْ كُنَّا نَسْمَعُ اَوْ نَعْقِلُ مَا كُنَّا فِيْٓ اَصْحٰبِ السَّعِيْرِ ۝ — (اور وہ یعنی اہل دوزخ کہیں گے، اگر ہم ہوش و گوش یعنی علم رکھتے تو دوزخ میں نہ جاتے)۔

یہ دنیوی زندگی کے فوائد و منافع، تو اس سلسلہ میں طالوت کی بادشاہی کے واقعے سے راہنمائی ملتی ہے جس کا ذکر سورۃ البقرہ رکوع ۳۲ میں ہے۔

اللہ تعالیٰ نے حکومت و سلطنت کے لئے طالوت کو اس لئے منتخب فرمایا کہ حکمرانی کا استحقاق دولت مندی پر موقوف نہیں بلکہ اس کا انحصار علم اور جسم میں فراخی پر ہے۔ اور طالوت کو ان دونوں سے حصہ وافر ملا تھا۔

علم کے ان عظیم دینی و دنیوی اور ظاہری و باطنی منافع و فوائد کے باعث قرآن میں اسکو خیر کثیر فرمایا گیا ہے۔ ارشاد ہوا،

وَمَنْ يُؤْتَى الْحِكْمَةَ فَقَدْ أُوتِيَ خَيْرًا كَثِيرًا۔	(اور جس شخص کو حکمت دے دی گئی، اس کو بلاشبہ خیر کثیر سے نواز دیا گیا)

اگرچہ لغوی اور اصطلاحی طور پر علم اور حکمت میں کسی قدر فرق ہو سکتا ہے لیکن اسلام میں دونوں لفظ ایک دوسرے کے معنی میں مستعمل ہوئے ہیں۔ علم کی اہمیت اور اس کی عظمت و شرف کا اندازہ اس سے بھی ہوتا ہے کہ اگرچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو علوم اولین و آخرین عطا کئے گئے تھے، لیکن چونکہ علم کی کوئی حد نہیں ہے اس لئے آپ کو حکم دیا گیا کہ رَبِّ زِدْنِي عِلْمًا (سورۃ طٰہٰ) کی دعا پڑھا کریں۔

علم، سماجی حقیقت اور اقدار

KNOWLEDGE, SOCIAL REALITY AND VALUE

آج کل کے مروجہ نظام علم و تعلیم میں بالعموم علمیات یا نظریہ علم (Epistemology) اور نظریہ یا فلسفہ قدر میں امتیاز کیا جاتا ہے۔ دنیا بھر کی یونیورسٹیوں میں فلسفے کے شعبوں میں نظریہ علم اور فلسفہ قدر یا اخلاق کو علیحدہ علیحدہ پڑھایا جاتا ہے جس سے اس امر کی نشاندہی ہوتی ہے کہ علم اور قدر (Factual Knowledge/value) کی دوئی کو تعلیم کے نظام میں مستقل حیثیت دے دی گئی ہے۔ حالانکہ یہ تقسیم عقلی طور پر محال ہے۔ اور اسلام اسے تسلیم نہیں کرتا۔ نظریہ علم یا علمیات کا ایک بنیادی سوال، یہ ہے کہ وہ احوال و ظروف کس قسم کے ہوتے ہیں جن میں علم کا حصول

ممکن ہوسکتا ہے۔ آج کے مادہ پرستانہ دور میں علم کی تعریف غلط طور پر صرف ان سوالات تک محدود کر دی گئی ہے جن کا تعلق صرف مادی دنیا اور اس کے واقعات (Facts) سے ہے۔ حالانکہ اگر علم کے موضوع میں خود اپنی ہستی کے بارے میں، حقیقت الحقائق یا بنائے حقیقت کے بارے میں اور سماج اور فرد کے اس سے تعلق کے سوالات شامل کئے جائیں تو اسلام کا یہ نقطہ نظر بالکل درست معلوم ہوتا ہے کہ سیکولرزم اور سائنٹفک ازم بنیادی طور پر ایسے گمراہ کن (Mystifying) نظریہ حیات ہیں جن میں لوگوں کو اپنی ہستی اور زندگی کے مقاصد اور اعلیٰ حقائق کے وقوف سے محروم رکھا جاتا ہے۔ علم کے مسئلہ پر صحیح طور پر مابعد الطبیعاتی حقائق اور سماجی تعلقات کے پس منظر ہی میں بحث ہوسکتی ہے۔ اور صرف اسی صورت میں گمراہ کن نظریات اور التباس علمی کو حقیقی علم سے بدلا جاسکتا ہے۔ اس تناظر میں علم کا مسئلہ سطحی اور خارجی مباحث سے ہٹ کر انسانی ذہن و عقل کی ساخت اور سماج و تمدن کے اس طرز سے بحث کرتا ہے جو علم کو ممکن اور قابل حصول بناتے ہیں۔ علم و آگہی کس طرح ذہن انسانی سے علاقہ کرتا ہے اور یہ کہ فرد اور اس کے علم میں کیا رشتہ ہونا چاہیئے۔ چنانچہ اس طرح تعلیم کے مستحسن اور حریت پسند طریقے (Non-oppressive forms of Knowledge) بھی زیر بحث آتے ہیں جن کے ذریعے لوگ اپنی تخلیقی صلاحیتوں اور مثبت افکار کا اظہار برملا کرتے ہیں اور اپنا اور سوسائٹی کا گہرا شعور حاصل کرتے ہیں۔ اس کے برعکس موجودہ سیکولر غیر مذہبی نظام ہائے زندگی میں افراد کو ایسا کرنے کی اجازت قطعاً نہیں دی جاتی۔ انہیں اپنے نظام زندگی کے بنیادی مسلمات کو چیلنج کئے بغیر اپنانے پر مجبور کیا جاتا ہے۔ اور ایک بڑی اکثریت ان مسلمات کے فہم و ادراک سے بھی عاری رہتی ہے۔

سطور بالا سے یہ امر واضح ہو جاتا ہے کہ رائج الوقت سیکولر نظام تعلیم اور فلسفہ علم، عقل و دانش کو تحدید اور تجزیہ (Fragmentation) کے ذریعے بے اثر بنا دیتا ہے۔ ہم مسلمان مفکرین کا اہم فریضہ یہ ہے کہ ہم موجودہ

اصطلاحات، علمی اور مباحث کو اپناتے ہوئے کسی بھی فکری استبداد کے ایجنٹ نہ بنیں - بلکہ ناقدانہ اور معروضی منہاج کو استعمال کرتے ہوئے سیکولر نقطۂ نظر کی فکر پر بالادستی کو قبول نہ کریں - اور ایک ایسے حقیقی اور مؤثر مذہبی کلچر کی تعمیر میں فعال حصہ ادا کریں جس میں زندگی کے تمام حقائق کا بطریق احسن اور منضبط طور پر خیال رکھا گیا ہو -

عصری فلسفہ و تفکر میں جس خصوصیت کی سب سے زیادہ اہمیت ہے میرے خیال میں وہی اس کا سب سے بڑا نقص ہے - جدید فلسفے میں مسائل کے نظری پہلوؤں پر اس انداز میں گفتگو ہوتی ہے گویا سوچنے والا ان مسائل سے علیحدہ اور باہر وجود (Scholarly Detachment) رکھتا ہے - اس کا لازمی نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ فلسفہ و تفکر میں ٹھوس اور حقیقی مواد باقی نہیں رہتا - یہی وجہ ہے کہ عصر حاضر کے بیشتر مفکرین کا اپنے ماحول اور سماجی حقیقت سے کوئی رشتہ باقی نہیں رہتا - ان کے خیالات زیادہ تر بالکل نظری اور صوری تحلیل کے حامل ہوتے ہیں - اور چونکہ ٹھوس حقائق کی دنیا سے ان کا کوئی تعلق نہیں ہوتا اس لئے معاشرے کی تعمیر میں وہ کوئی حصہ ادا نہیں کر سکتے - اس کے برعکس مسلمان مفکرین کو دور از کار بے سود اور لایعنی مسائل میں الجھنے کی بجائے اپنی ذات کے شعور اور مثبت سماجی تبدیلی کے حصول میں کوشاں ہونا چاہیئے - اور بنی نوع انسان کو انسان دشمن اور استحصالی فلسفیانہ افکار سے نجات دلاکر مذہب کے وسیع اور انسانیت پرور تصور کی روشنی میں علم و تحقیق کی تعمیر نو کرنی چاہیئے - ان خیالات کو زیادہ آسان فہم انداز میں بزبان انگریزی یوں ادا کیا جا سکتا ہے

We Muslims should stand for less academics and more self-understanding and concrete social change. We should liberate humanity from inhuman and enslaving philosophical presuppositions and reconstrue knowledge in the light of broad religro-humanistic framework of Islam.

تاریخی طور پر بنی نوع انسان کے موجودہ علمی و تمدنی انتشار اور بگاڑ کا آغاز یورپ کی اٹھارویں صدی کی تحریک عقلیت پسندی یا روشن خیالی سے شروع ہوتا ہے۔ جس میں عقل (ایک محدود تصور کے ساتھ) اور تجسس، علمی منہاج کے دو اہم ستون قرار پائے۔ اس تحریک کے فلاسفہ اور مفکرین نے مختلف علوم اور سائنس پر تحقیق ہی نہیں کی، بلکہ ان سے زندگی کے بارے میں جامع نقطہ نظر بھی اخذ کرنا چاہا۔ سائنسی علوم سے انہوں نے تشکیک اور تدریجی استنتاج کا انداز اختیار کیا جس کا سب سے بڑا علمبردار فرانسیسی مفکر ڈیکارٹ ہے۔ مزید برآں تجسس و دریافت کے عمل سے مطابقت رکھتا ہوا اضافیت پسند طرز فکر (Relativistic attitude) مذہبی عقائد اور زندگی کی عظیم تاریخی اقدار کو جڑ سے اکھاڑ پھینکنے کے لئے استعمال کیا گیا۔ عجیب بات یہ ہے کہ اس فلسفیانہ تشکیک اور اضافیت پسندی کو انسان کی عظمت بڑھانے میں ممد سمجھا گیا۔ حالانکہ بعد کے ڈیڑھ دو سو سال کے واقعات نے مغربی مفکرین کے اس خیال کو خوش فہمی سے زیادہ کچھ ثابت نہ کیا۔ بیکن، ڈیکارٹ، ہابس لاک، نیوٹن — ان تمام مفکرین نے حقیقت (Truth) کو جاننے کے عقل (Rational) معیار پر بالعلیہ زور دیا۔ نیوٹن کے میکانیاتی منہاج کو اس پورے طریق علم میں مرکزی حیثیت حاصل رہی۔ انیسویں صدی میں عقلیت پسندی، مادیت اور ماری نقطہ نظر کے ایک بڑے خطہ ارضی پر غلبے کے ساتھ اپنے نقطۂ عروج پر پہنچ گئی۔ اثباتیت، مارکسی ماریت اور بیسویں صدی کے اوائل میں شروع ہونے والی ایک تحریک منطقی تجربیت نے اقدار (Values) کو علم کے دائرے سے یکسر خارج کر دیا۔ اخلاقی اقدار کے مباحث کے بارے میں کہا گیا کہ یہ علم یا (Proper Knowledge) کا حصہ نہیں۔ چنانچہ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ افادیت پسندی (Utilitarianism) کے مکتب فکر نے اپنے قدم جمالئے۔ جس میں اگرچہ نظری طور پر تو خوشی یا مسرت کی بات کی گئی لیکن عملاً خوشی کا تعین زیادہ سے زیادہ مادی اشیاء کی فراہمی اور جسمانی سہولت کے حصول سے کیا گیا۔ موجودہ دور کی صنعتی تہذیب میں اس رویے کی عملداری

ہر شخص دیکھ سکتا ہے ۔

انگلستان کی یونیورسٹیوں میں تعلیم کے دوران میں نے خود یہ احساس شدت سے محسوس کیا ہے کہ کم از کم اینگلو امریکن لسانی اور تحلیلی فلسفہ انسانی تمدن، اخلاق اور علمی مسائل حل کرنے میں بالکل قاصر ہے ۔ اور وہاں کے نوجوان طلباء کی ایک بڑی تعداد جدید فلسفے سے بیزار نظر آتی ہے ۔ ان کے ساتھ گفتگو کے بعد جو خیال شدت سے ذہن میں ابھرتا تھا اس کو بزبان انگریزی یوں ادا کیا جا سکتا ہے ۔

Contemporary Anglo-American linguistic and analytic philosophy is at a dead end. Its acadamic practitionars have abandoned the attempt to understand the world, let alone change it. They have turned philosophy into a narrow and specialized acadamic subject of little relevance and interest of any-one outside the small circle of pro-fessional philosophers. The result has been that serious philosophical work beyond the convertional sphere has been minimal.

ہنرک سکولیموسکی نے اپنے مضمون میں جو انگریزی مجلے 'ECOLOGY' کے جنوری ۱۹۷۱ء کے شمارے میں شائع ہوا، موجودہ دور کے علمی اور تعلیمی رجحان کو " BAZAROVISM " سے تعبیر کیا ہے ۔ یہ لفظ اس نے ترگینیو کے ناول 'Fathers and Children' سے اخذ کیا ہے جس کا مرکزی کردار Sergei Bazarov عصر حاضر کے ملحد، مادی اور سائنسی نقطہ نظر رکھنے والوں کی نمائندگی کرتا ہے ۔ ان حضرات کے نزدیک Fact اور Positive Knowledge کے علاوہ کسی اور چیز کی کوئی حقیقت نہیں ۔

He has no use for art, for poetry, for other romantic rubbish. The modern man is engulfed so completely by the wor-ship of reason and scientific fact and

bogus empericism that it is often difficult to see through them and assess their impact on society. According to Skolimowski, Bazarov is at once an embodiment of the prevailing nehilism, materialism, scientism and positivism, which in their respective ways regarded intrinsic values as secondary, insignificant, or even non-existent in the world of cold fact, clinical objectivity and scientific reason.

اس کے برعکس اسلامی نقطہ نظر سے علم صرف مادی اور واقعاتی یا سائنسی معلومات کے ذخیرے کا نام نہیں - بلکہ انسان کے اس مابعد الطبیعاتی کلی نظریے کا حصہ ہے جس میں وہ نہ صرف سائنسی معلومات اکٹھی کرتا ہے بلکہ خود اپنی حقیقت، ماہیت کائنات، خالق کائنات اور مبدا و معاد جیسے تمام اہم سوالات سے بحث کرتا ہے - مشہور فلسفی لڈوگ وٹگنسٹائن نے اسی خیال کو ایک دوسرے انداز میں اس طرح پیش کیا ہے -

"Even if every possible scientific question were answered, the problem of our living would still not been touched at all."

چنانچہ قرآن کا نظریہ علم حیاتِ انسان کے ایک مکمل تصور Total Gestalt کا ایک جزو ہے - اس میں علم اور عمل دونوں کا چولی دامن کا ساتھ ہے - ایک مشہور مقولہ ہے "العمل بلا علم ضلال والعلم بلا عمل وبال" - جو عمل علم کے بغیر ہو وہ گمراہی ہے اور جو علم عمل کے بغیر ہو وہ وبال اور مصیبت ہے - جو لوگ اپنے علم پر عمل نہیں کرتے، قرآن و حدیث میں ان کی شدید مذمت آئی ہے - ایک آیت میں علم بے عمل کو اس گدھے سے تشبیہ دی گئی ہے جس پر کتابیں لدی ہوں - اس بنا پر قرآن کی اصطلاح میں وہ عالم بھی جاہل ہے جو اپنے علم پر عمل نہیں کرتا - از روئے قرآن علم صرف تصوراتی سطح پر صحیح معنوں میں علم نہیں ہوتا ہے - یہ علم اس وقت بنتا ہے جب

یہ طالب حق کے وجود میں سرایت کر جائے اور اس کا عمل اس کے مطابق ہو جائے۔

Knowledge in the framework of Islam can not be squared with an anti-activist or 'spactater' view of it which aims merely at an enlargement of the understanding. Indeed it here becomes an essentially practical subject it seeks to get people to do things. It cannot remain uncommitted to social action.

علم کے ذرائع

آخر میں ایک اہم سوال پر جو حصول علم کے ذرائع سے متعلق ہے۔ مختصراً روشنی ڈالوں گا۔ علم حاصل کرنے کے منابع و ذرائع کیا ہیں۔ قرآن مجید نے اس سوال کا جواب بھی تشنہ نہیں چھوڑا اور اسے متعدد مواقع پر مختلف اسالیب سے واضح کیا ہے۔ جہاں تک میں سمجھ سکا ہوں قرآن علم کی دو قسمیں بیان کرتا ہے۔

(۱) علم حضوری، جو بلا کسی واسطہ اور ذریعہ کے براہ راست حاصل ہوتا ہے۔ مثلاً انسان کو خود اپنی ذات اور اسکی کیفیات و محسوسات کا علم۔ اس کو وجدان، الہام یا فطرت بھی کہتے ہیں۔ اسکی ابتدائی شکل حیوانوں میں بھی پائی جاتی ہے۔ مثلاً قرآن میں آتا ہے۔ وَفِیْ اَنْفُسِکُمْ اَفَلَا تُبْصِرُوْنَ (تم لوگ خود اپنے نفس یا ذات کے اندر کیوں نہیں دیکھتے)۔ یہ فرما کر اسی ذریعہ علم کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ اسی طرح ارشاد ہوتا ہے۔ فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَتَقْوٰهَا۔

(۲) علم کی دوسری قسم ہے علم حصولی۔ یہ اس علم کا نام ہے جو کسی شے کے واسطہ سے حاصل ہوتا ہے۔ اس علم کے حصول کے تین ذرائع ہیں۔ (۱) وحی الٰہی (۲) عقل (۳) حواس خمسہ

قرآن میں جا بجا انسانوں کو تاکید کی گئی ہے کہ وہ خدا تعالےٰ کی عطا کردہ ان قوتوں کو بروئے کار لائیں جو علم کا ذریعہ بنتی ہیں۔ اس کے برخلاف جو لوگ ان قوتوں سے کام نہیں لیتے، یہاں تک کہ وہ زنگ آلود ہو جاتی

ہیں، ان کی شدید مذمت کی گئی ہے - سورہ اعراف کی آیت ۱۷۹ میں فرمایا۔
"ان کے پاس دل ہیں، مگر یہ ان سے سمجھ کا کام نہیں لیتے - ان کے پاس آنکھیں ہیں جن سے یہ نہیں دیکھتے، ان کے پاس کان ہیں - مگر یہ ان سے سنتے نہیں - یہ لوگ چوپایوں کی طرح ہیں - بلکہ ان سے بھی زیادہ گئے گزرے ہیں - اور یہی لوگ تو غافل ہیں۔"

اس آیت میں قلب کو آلہ تفقہ قرار دیا گیا ہے - یہ ایک نہیں، قرآن مجید میں اس جیسی اور متعدد آیات ہیں جن میں ان لوگوں کے لئے سخت وعید سنائی گئی ہے اور ان کا ٹھکانہ دوزخ بتایا گیا ہے جو فہم و ادراک اور تعقل و تفکر کی صلاحیتوں سے کام نہیں لیتے اور اسی لئے جاہل بنے رہتے ہیں -

مندرجہ بالا آیت کے حصے "لَهُمْ قُلُوبٌ لَا يَفْقَهُونَ بِهَا" میں قلب کو آلہ تفقہ قرار دیا گیا ہے - تفقہ صرف منطقی Discursive فکر کا نام نہیں - جس میں اشیاء پر علیحدہ علیحدہ اور صرف ظاہر اشیاء پر نظر ڈالی جاتی ہے - تفقہ وہ گہرا اور تالیفی فکر ہے جس میں حقیقت کا من حیث المجموع وقوف حاصل کیا جاتا ہے - اور انائے صغیر کا انائے کبیر کے ساتھ براہ راست تعلق پیدا ہوتا ہے - چنانچہ حقیقت کے کل ادراک کے لئے مشاہدات حواس کو فؤاد یا قلب کے اس وظیفہ سے بھی مدد لینی ہوگی جسے قرآن نے تفقہ کہا ہے - میرے خیال میں شاعر مشرق علامہ اقبال نے اسی کو عشق کہا ہے - بالکل اسی خیال کا اظہار امریکی عیسائی مفکر پال ٹلک نے ان الفاظ میں کیا ہے -

"Full knowledge does not admit a difference between itself and love, or between theory and practice." (The shaking of the foundation, P.115.)

حقیقت یہ ہے کہ عقل انسانی کی نوعیت و ماہیت سے آج کا جدید ذہن بالکل ناواقف ہے - اس نے عقل کو صرف استنباط و استقراء کا آلہ یا Functional Intelligence سمجھ رکھا ہے - جبکہ دراصل عقل انسانی کے سوتے انسان کے انتہائی اندرونی روحانی مرکز سے پھوٹتے ہیں - عربی زبان

میں عقل اس صلاحیت یا اس چیز کو کہتے ہیں جو انسان کو خالق کائنات کی سمت بناتے یا اس سے باندھے - اس مفہوم میں یہ لفظ طابعی الفاظ Intell-clus or Nous & Ratio (reason) کے مترادف ہے - از روئے قرآن عقل (عقل سلیم) انسان کو صراط مستقیم سمجھا کر اُخروی کامیابی سے ہمکنار کر سکتی ہے - وحی الٰہی عقل کی اس استعداد کو مزید تقویت پہنچاتی ہے - اگر عقل پر جذبات اور شہوات کے پردے پڑ جائیں اور نفس امارہ اس پر غالب آجائے تو عقل انسانی حقیقت سے محجوب ہو جاتی ہے -

قرآنی نظریہ علم کی ایک کلید لفظ "تذکّر" اور اس کے مشتقات پر غور کرنے سے بھی حاصل ہوتی ہے - تذکر، ذکر، تذکیر قرآن کی انتہائی اہم اصطلاحات ہیں -

OOOOOOOOO

لسان العصر اکبر الٰہ آبادی مرحوم
کے کلام کو سمجھنے کے لئے
پروفیسر یوسف سلیم چشتی کی تالیف
شرح تلمیحات و مشکلاتِ اکبر
کا مطالعہ اکسیر کا درجہ رکھتا ہے
قیمت فی نسخہ ...... -/۱۵ روپے (محصول ڈاک علاوہ)

قرآن مجید کے احسانات عربی زبان و ادب پر

از قلم : ڈاکٹر ذوالفقار علی ملک
صدر شعبۂ عربی جامعہ پنجاب

تمام اسلامی تعلیمات کا سرچشمۂ فیض ، انسان کی جسمانی و روحانی اصلاح کا منبع و مأخذ، جمیع علوم اسلامیہ و عربیہ کا مرجع و مرکز، مسلمانوں کی ترقی کا راز سربستہ، عالم کی تاریکیٔ جہالت کو فنا کر دینے والا آفتاب درخشاں، نوع انسانی کو سعادت ابدی اور نجات اُخروی و سرمدی کی منزل مقصود تک پہنچانے والا ہادیٔ برحق قرآن مجید و فرقانِ حمید ہے۔

قرآن مجید نے عربوں کی تہذیبی، تمدنی، اخلاقی، معاشرتی ، ذہنی اور سیاسی اصلاح کے ساتھ ساتھ ان کے ذہنی اور دماغی قوی کو علم و حکمت کی تحصیل و تکمیل پر آمادہ کیا اور اس طرح وہ ایک طرف اجڈوں کے درجہ سے ترقی کر کے بہترین قوم یعنی خیرالامم بن گئے اور دوسری طرف جہالت و ضلالت کی گھناؤنی تاریکیوں سے نجات پا کر انہوں نے اطراف و اکناف ربع مسکون ارضی میں علوم و فنون کی تحصیل و ترویج کے سلسلے میں ایسے کارنامے انجام دیئے کہ تاریخ میں اُن کی مثال نہیں ملتی ۔ مسلمانوں کے یہ کارنامے ایسے واضح روشن اور بدیہی ہیں کہ مخالفین و معاندین اسلام اُن کا اعتراف کرنے پر مجبور ہیں ۔

قرآن مجید کے عربی زبان و ادب پر احسانات پر گفتگو کرنے سے قبل یہ مناسب ہوگا کہ نزول قرآن اور ظہورِ اسلام سے قدیم جاہلی علوم میں جو تغیرات رونما ہوئے اُن کا سرسری تذکرہ کر دوں ۔ قدیم عربی ادب کا مطالعہ کرنے سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اسلام کی وجہ سے علوم عرب میں تین قسم کے تغیرات رونما ہوئے۔

۱ - اسلام نے جاہلیت کے ایسے علوم کو جو خلاف عقل تھے یا وہ بے ہودہ

اور احمقانہ تھے، باطل قرار دے دیا اس سلسلے میں کہانت اور عرافت کی مثال دی جا سکتی ہے۔

۲۔ دورِ جاہلیت کے مفید علوم کو اختیار کیا اور انہیں بہت ترقی دی مثلاً لغت، کتابت، خطابت اور شعر

۳۔ بہت سے نئے علوم پیدا کئے۔

ظہورِ اسلام کے بعد عربوں کے علوم دو حصوں میں منقسم ہو گئے تھے۔ قدیمہ اور جدیدہ۔ قدیمہ سے مراد وہ علوم تھے جو دورِ جاہلیت میں موجود تھے۔ جدیدہ سے مراد وہ علوم تھے جو ظہورِ اسلام کے بعد عربی زبان میں معرضِ وجود میں آئے یا دیگر زبانوں سے منتقل ہوئے۔

ہم ان علوم پر قرآن مجید اور اسلام کے اثرات کا مختصر جائزہ لیں گے اس جائزے کی ابتداء علوم قدیمہ جاہلیہ سے کی جائے گی۔

زبان ولغت

ہر قوم کی زبان اُس کی عقل و فراست اور اخلاق و آداب کی آئینہ دار ہوتی ہے۔ اور کسی قوم کی زبان سیکھ کر اُن کی دینی و اخلاقی حالت کا بہت حد تک اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ کوئی قوم بھی ہمیشہ یکساں حالت میں نہیں رہتی۔ اُسے عروج و زوال کے مختلف ادوار و مراحل سے گزرنا پڑتا ہے۔ ان ادوار کے آثار اُن کی زبان میں ہمیشہ کے لئے محفوظ رہ جاتے ہیں جن سے اُن کی تاریخ لکھنے کے لئے بہت کچھ مواد مل سکتا ہے۔ اہل عرب دورِ جاہلیت میں اپنے ملک کے مخصوص جغرافیائی حالات کی بنا پر خانہ بدوش اور صحرا نورد تھے، غارتگری اور کشت وخون اُن کا کام تھا۔ بنا بریں ان کی زبان اغراض بدویت سے مالا مال اور جذبات جدال و قتال سے معمور ہے۔ شعر و خطابت جاہل عربوں کے مایہ ناز فن تھے۔ لیکن اُن کی شاعری و خطابت کا موضوع بدوی زندگی کی عکاسی اور جاہلی کارناموں پر فخر کرنا ہے۔ اُن میں نہ تو اخلاقیات پر بحث ہے اور نہ علوم عقلیہ کی موشگافیاں نظر آتی ہیں۔

لیکن جب آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم مبعوث ہوئے اور قرآنی ہدایات ساتھ لائے تو اُس کی اتباع میں ایسی روح پیدا ہو گئی جس نے اُن کو آسمان کمال پر آفتاب کی طرح روشن کیا۔ ذرّے کا آفتاب ہو جانا۔ قطرے کا دریا بن جانا۔ وحشی و

جاہل قوم کا اخلاق و آداب، علم و فضل اور ہدایت و سعادت میں دیگر اقوام کے لئے نمونہ بن جانا قرآنی تعلیمات کا ادنیٰ کرشمہ تھا۔ قرآن مجید نے عربوں کی زبان کو اتنی ترقی دی کہ دنیا کی کوئی دوسری زبان اُس کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔

اسلام کا عربی زبان پر جو اثر ہوا اُس کی تفصیل یہ ہے۔

ظہورِ اسلام سے قبل جزیرہ نمائے عرب کے مختلف قبائل کے ہاں اُن کے اپنے اپنے لہجے مروج تھے وہ سب اگرچہ عربی زبان بولتے تھے لیکن اُن کے محاورات اور الفاظ اور تراکیب میں بہت فرق تھا۔ قدیم عربی ادب کی کتابوں مثلاً الاغانی۔ الکامل۔ البیان۔ العقد اور صبح الاعشیٰ اور ادب الکاتب میں ان قدیم لہجوں کا تذکرہ موجود ہے۔ عربی زبان پر قرآن مجید کا سب سے بڑا احسان یہ ہے کہ اُس کی بدولت تمام جزیرہ نمائے عرب کا اتحاد عربی زبان کے ایک لہجے یعنی لہجہ قریشی پر ہو گیا کیونکہ قرآن مجید اسی لہجے میں اسی قبیلے کے ایک فرد آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوا تھا۔ عربی زبان کے ایک لہجے پر عربوں کے اتحاد و اتفاق کے بعد اُن کی زبان میں ایک عالمی اور بین الاقوامی زبان کی حیثیت سے بیرونِ عرب پھیلنے، پھولنے کی صلاحیت پیدا ہو گئی جو کہ قبل ازیں مفقود تھی۔ مختلف علمی اور سائنسی علوم کو اپنے اندر سمونے کی صلاحیت بھی اس کے بعد معرضِ وجود میں آئی اگر قرآن مجید عربی زبان میں نازل نہ ہوتا تو عربوں کا اجماع کبھی بھی ایک لہجے پر نہ ہو سکتا اور نتیجتاً عربی زبان ایک عظیم اور اہم زبان کی حیثیت حاصل نہ کر سکتی۔

(۲) ظہورِ اسلام سے قبل عربی جزیرہ نمائے عرب کی سرحدیں تک محدود و محصور تھی۔ نزولِ قرآن کے بعد جب مسلمان تبلیغ و تلقین اسلام کے لئے اطراف و اکناف دنیا میں پھیلے تو ان کی بدولت عربی زبان بھی ان ممالک میں روشناس ہوئی اور جب ان ممالک کے لوگوں نے اسلام قبول کرنا شروع کیا تو قرآن مجید اور اسلام کی زبان ہونے کے باعث اسے ان ممالک میں پھیلنے کا موقع مل گیا۔ جزیرہ نمائے عرب سے باہر کے عربی ممالک مثلاً عراق، شام، مصر اور افریقہ وغیرہ میں۔ عربی زبان اسلام کی بدولت پھیلی اور رفتہ رفتہ ان ممالک کی اصل زبانوں پر غالب آ گئی اور انہیں ختم کر دیا۔

مرورِ قرن ہا قرن کے بعد ان ممالک کی عربی زبان میں مخصوص ماحول، تمدن اور حالات کی بنا پر تبدیلیاں رونما ہوگئیں اور اس طرح عربی زبان کے مختلف مقامی اور محلی لہجے پیدا ہوگئے۔ اصطلاح میں ان لہجوں کو لغت دارجہ (Colloquial Arabic) کہتے ہیں۔ ایک ملک کا عامی لہجہ بعض اوقات دوسرے ملک کے لہجے سے اتنا مختلف ہوتا ہے کہ عربی بولنے والے بھی ایک دوسرے کی بات نہیں سمجھ سکتے۔ جب تک مسلمان برسر اقتدار رہے اور اُن کا تمدن عروج پر رہا ان دارجہ لہجوں کی بنا پر کوئی خاص پریشانی لاحق نہ ہوئی۔ لیکن جب مسلمان انحطاط کا شکار ہوئے اور مختلف سامراجی قوتوں نے مسلمانوں کے علاقوں پر قبضہ جمانا شروع کر دیا تو اُنہوں نے مسلمانوں میں تفرق و تشتت کے بیج بونے کے لئے اُنہیں یہ احساس دلانا شروع کیا کہ وہ ایک قوم نہیں ہیں۔ اُن کی زبان بھی ایک نہیں بلکہ اُن کے مقامی لہجے ہیں لہٰذا اُن کو روزمرہ بول چال میں اور شاعری میں بھی مقامی بولی کو استعمال کرنا چاہیے۔ فصیح عربی ایک غیر ملکی زبان ہے جس میں وہ اپنے ما فی الضمیر کو کما حقہٗ ادا نہیں کر سکتے۔ یہ بات ثابت کرنے کے لئے مستشرق حضرات نے دلائل و شواہد کے انبار لگا دیئے اُن کا مقصد یہ تھا وہ مسلمانوں میں تفرق و تشتت کے بیج بو کر انہیں ایک دوسرے کے خلاف صف آرا کر کے اپنے استعماری جڑیں مضبوط کرنا چاہتے تھے۔ ان حالات میں قرآن مجید نے دوبارہ عربی زبان کو سہارا دے کر عربوں پر احسان عظیم کیا۔ اس مقدس کتاب کی بدولت فصیح عربی معدوم ہونے سے بچ گئی اور اس کے ساتھ ساتھ عربوں کا قومی تشخص اقوام یورپ کی ریشہ دوانیوں سے محفوظ رہا۔ اگر دنیا بھر کے مسلمان قرآن مجید کی فصیح عربی زبان میں تلاوت نہ کرتے ہوتے تو اقوام یورپ کی معاندانہ کوششوں سے باعث فصیح عربی ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ختم ہو جاتی اور اس کی جگہ محلی لہجے لے لیتے جس کا نتیجہ یہ نکلتا کہ عربوں کا ایک قوم کی حیثیت سے وجود ختم ہو جاتا۔ عربی زبان کی وہی حالت ہو جاتی جو زوال روم کے بعد لاطینی کی ہوئی تھی۔ قرآن نے عربی زبان کی حفاظت کی اور آج اس کتاب کی بدولت افریقہ کے دور دراز علاقوں میں رہنے والا عرب میں کے

دشوار گزار پہاڑی علاقوں میں بسنے والے عرب کی بات سمجھ سکتا ہے اور اُس سے گفتگو کرنے پر قادر ہے۔ قرآن مجید پڑھنے کی بدولت دنیا کے دور دراز علاقوں کے رہنے والے مسلمانوں میں بھی فصیح عربی پڑھنے اور سمجھنے کی صلاحیت پیدا ہو جاتی ہے۔ چنانچہ مختلف علاقوں میں علماء دین عربی بول اور سمجھ سکتے ہیں۔ قرآن مجید کی بدولت عربی زبان کو مسلمانوں کی ایک بین الاقوامی زبان کی حیثیت حاصل ہو چکی ہے۔ دنیا کی کسی دوسری مذہبی کتاب نے اپنی زبان کی اس طرح حفاظت وصیانت نہیں کی جس طرح قرآن مجید نے عربی کی کی ہے اور اس اعتبار سے بھی قرآن مجید کو دیگر مذہبی کتب پر فوقیت و فضیلت حاصل ہے۔

ظہورِ اسلام کے بعد زبان کے اغراض و مقاصد بہت وسیع ہو گئے۔ دورِ جاہلیت میں عام طور پر لغت کا استعمال بدوی زندگی خانہ بدوشی اور صحرانوردی کی تفصیلات اور باہمی جدال و قتال اور کشت وخون کے واقعات بیان کرنے کے لئے ہوتا تھا لیکن ظہورِ اسلام کے بعد عقائد دینیہ، احکام شرعیہ، امور سیاسیہ اور اجتماعیہ اور اخلاقیات وغیرہ عربی زبان میں بیان ہونے لگے اور اس کے باعث عربی لغت میں نئے نئے الفاظ، اصطلاحات اور تراکیب داخل کی گئیں جس سے عربی زبان کی لغوی ثروت میں بیش بہا اضافہ ہوا جس کے باعث عربی آئندہ صدیوں میں ایک عظیم عالمی زبان بننے کے قابل ہو سکی۔

عربی زبان کے الفاظ و اسالیب میں قرآن مجید کے زیر اثر بڑا تغیر پیدا ہوا اگرچہ عربی زبان میں اصطلاحات عباسی دور میں مقرر کی گئیں تاہم صدر اسلام میں ہی بعض الفاظ لغوی معنی چھوڑ کر خاص اصطلاحی معنوں میں استعمال ہونے لگے مثلاً۔ صلوٰۃ، صیام، زکوٰۃ، مؤمن، کافر، فاسق، منافق، رکوع، سجود، حج، خلیفہ، امیر المؤمنین، کاتب، عامل قاضی، بیت المال وغیرہ بے شمار الفاظ لغوی معنی کے برعکس ایک خاص اصطلاح کے طور پر استعمال ہونے لگے۔

اُسلوبِ گفتگو میں بھی بہت فرق آگیا۔ سب سے پہلے حضرت عمرؓ نے اطال اللہ بقاءک کے الفاظ حضرت علیؓ کے بارے میں استعمال کئے۔ اس طرح کے الفاظ دورِ جاہلیت میں کبھی استعمال نہ ہوتے تھے۔ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم سے بہت سی

ایسی تراکیب اور بندشیں مروی ہیں جن کو سب سے پہلے آپ نے استعمال فرمایا: مثلاً :-
یاخیل اللہ ارکبی ، مات حتف انفہ، لا تنتطح فیہ عنزان ، الآن حمی الوطیس ، لا یلدغ المؤمن من جحر مرتین، کل الصید فی جوف الفراء، ھدنۃ علی دخن وجماعۃ علی اقذاء ، ان محاورات کے بارے میں الجاحظ لکھتے ہیں :- لم یسبقہ الیہ عربی، ولم یشارکہ فیہ عجمی ولم یدع لأحد ولا ادعاہ احد، مما صار مستعملا و مثلا سائرا (البیان ۲۱۳) ان جدید محاورات وتراکیب کی بدولت عربی زبان کی علمی ثروت اور ذخیرہ الفاظ وتراکیب میں بیش بہا اضافہ ہوا اور عربی زبان میں اظہار مزید آسان ہوگیا - اس طرح بہت سے الفاظ جو زمانہ جاہلیت میں مروج تھے بدلے ہوئے سماجی، دینی اور سیاسی ماحول میں متروک ہوگئے - مثلاً مرباع یعنی مال غنیمت کا ¼ حصہ جو فوج کا افسر موقع پر وصول کر لیا کرتا تھا نشیطہ یعنی مقام مقصود سے پہلے راستے میں جو مال مل جائے - فضول یعنی تقسیم کے بعد جو مال غنیمت بچ جائے اور تقسیم نہ ہوسکے - المکس ایک خاص قسم کا سکہ اسی طرح دور جاہلیت کا گڈ مارننگ : انعم صباحا ، گڈ ایوننگ انعم ظلاما یا بادشاہ ابیت اللعن کہنا ترک کر دیا گیا اور اسکی جگہ اسلام کے السلام علیکم نے لے لی۔

شعرا اور خطیب کے اسلوب میں بھی تانق وتفنن پیدا ہوگیا - آیات قرآنی اور احادیث نبوی شعراء وخطباء کی زبانوں پر چڑھ گئیں - کلام الہی اور حدیث نبوی نے شعراء کے مذاق میں عفت وپاکبازی اور لطافت ونزاکت پیدا کر دی ، کوئی خطبہ ایسا نہ ہوتا تھا جس میں قرآنی آیتیں یا احادیث نبوی بیان نہ کی جاتی ہوں، قرآن مجید کے الفاظ استعمال کرنے کی بہت کوشش کی جاتی - بعض خطیبوں نے تو اپنے خطبوں کو کلی طور پر قرآن مجید کے الفاظ سے ہی مرتب کرنا شروع کر دیا - چنانچہ مصعب ابن الزبیر جب عراق آئے اور انہوں نے اہل عراق کو اپنے بھائی کی بیعت واطاعت پر آمادہ کرنا چاہا تو انہوں نے یہ خطبہ دیا - بسم اللہ الرحمن الرحیم ، طسم تلک آیات الکتاب المبین ، نتلوا علیک من نبأ موسی وفرعون بالحق لقوم یؤمنون ، ان فرعون علا فی

الارض وجعل اھلھا شیعا یستضعف طائفۃ منھم یذبح ابناء ھم ویستحی نساء ھم انہ کان من المفسدین (ان الفاظ کے بعد انہوں نے شام کی طرف اشارہ کیا) اور ——— : و نرید ان نمن علی الذین استضعفوا فی الارض ونجعلھم ائمۃ و نجعلھم الوارثین (اور اس کے بعد انہوں نے حجاز کی طرف اشارہ کیا) اور کہا: ونمکن لھم فی الارض ونری فرعون وھامان و جنودھما منھم ما کانوا یحذرون (اور اس کے بعد عراق کی طرف اشارہ کیا - یہ خطبہ پورے کا پورا قرآن مجید کے الفاظ پر مبنی ہے مسلمان اُن خطبوں کو جن میں آیات قرآنیہ نہ ہوتیں ناپسند کرتے تھے اور انہیں حقارت سے البتراء یا الشوھاء کہتے تھے -

جب تک اہل عرب کو عجمیوں کے ساتھ اختلاط کا موقع نہ ملا تھا عربی زبان میں لحن یعنی اعرابی اور نحوی غلطیاں شاذونادر ہی صادر ہوتی تھیں - لیکن جب اشاعت اسلام کے بعد غیر عرب اقوام نے عربی زبان سیکھی تو چونکہ عربی اُن کی مادری زبان نہ تھی اس لئے وہ نحوی غلطیوں کا ارتکاب کرنے لگے - اس طرح وہ عرب بھی جنہیں عجمیوں کی صحبت [illegible] لحن سے محفوظ نہ رہ سکے - مروی ہے کہ حضرت بلال کا تلفظ حبشی [illegible] سلمان کا فارسی اور حضرت صہیب کا رومی تھا - چونکہ [illegible] ان سے خالص عربوں کی سی صحیح عربی کی توقع نہیں [illegible] منقول نہیں - ایک روایت میں ہے کہ ایک شخص نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر کچھ کہا جس میں اُس سے لحن سرزد ہوا تو آپ نے اپنے صحابہ سے فرمایا: ارشدوا اخاکم فقد ضل؛ جب ہزاروں عجمی اسلام قبول کر کے عربوں کے ساتھ بھائیوں کی طرح رہنے لگے تو [illegible] کثرت کے ساتھ نظر آنے لگے - البتہ [illegible] سے پاک رہا [illegible] کی اس بڑھتی ہوئی خرابی کو روکنے کے لئے علم نحو وضع کیا گیا [illegible] تفصیل آگے بیان کی جائے گی -

کتابت: اسلام سے قبل لکھنے پڑھنے کا رواج بہت ہی کم تھا - ظہور اسلام

کے وقت صرف دس بارہ قریشی لکھنا جانتے تھے سب سے پہلے آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے کتابت کو عام کرنے کی طرف توجہ دی - آپ نے اسیران بدر میں جو لوگ لکھنا جانتے تھے اُن سے کہا کہ مدینہ کے دس دس بچّوں کو لکھنا سکھا دو اور آزاد ہو جاؤ - نزول قرآن کے اختتام تک آپ کے کاتبین کی تعداد ۴۰ تک پہنچ گئی تھی - ابتداء میں مسلمان خط حیری یا انباری میں لکھا کرتے تھے - جب ۱۸ھ میں حضرت عمرؓ نے کوفہ کی بنیاد رکھی تو اہل حیرہ و انبار میں سے باقی لوگ وہاں آ آباد ہوئے اور وہاں اُنہوں نے خط حیری و انباری کی مزید اصلاح اور درستی کی اور یہ خط کوفہ کی طرف منسوب ہو کر خط کوفی کے نام سے مشہور ہوا - یہ کوفی خط ابتدائی اور غیر ترقی یافتہ صورت میں تھا - اس میں ایک حرف کو دوسرے حرف سے ممیز کرنا بہت مشکل تھا - اس میں نہ نقطے تھے اور نہ زیر زبر اور پیش - عرب فطری ملکے کی بنا پر اس خط کو صحیح پڑھ لیتے تھے لیکن جب اسلامی فتوحات کا دائرہ وسیع ہوا اور غیر عرب اقوام حلقہ بگوش اسلام ہونے لگیں تو یہ خوف دامنگیر ہوا کہ کہیں قرآن مجید میں بھی لحن نہ ہونے لگے - چنانچہ قرآن مجید کو صحیح پڑھنے کے لئے نقطے اور زیر زبر پیش یعنی اعراب وضع کئے گئے اور خط کو بہتر بنانے کی کوشش کی گئی - حرکات ابو الاسود الدؤلی نے وضع کیں - وہ فتحہ پر دلالت کرنے کے لئے حرف کے اوپر، کسرہ کے لئے حرف کے نیچے اور ضمہ کے لئے حرف کی شمالی جانب ایک نقطہ دیا کرتا تھا

تنوین کی صورت میں وہ دو نقطے لگاتا جو اصل تحریر سے مختلف روشنائی میں ہوتے - نصر بن عاصم اور یحیی بن یعمر نے حجاج کے حکم سے حروف کے اوپر اور نیچے نقطے لگانے شروع کئے - اس کی ضرورت بھی قرأت قرآن میں تصحیف سے محفوظ رہنے کے لئے محسوس ہوئی کیونکہ نقطوں کے بغیر د اور ذ، ص اور ض اور ان کی طرح کے دوسرے حروف میں تمیز مشکل ہے، بعد ازاں عباسی دور میں خط کو مزید بہتر بنایا گیا اور مختلف حسین و جمیل خطوط ایجاد ہوئے - عربی کتابت میں جتنی ترقی ہوئی وہ سب قرآن مجید کی مرہون منت ہے مختلف ادوار میں مختلف خطاط خط کو بہتر سے بہتر بنانے کی جو مستقل کوشش کرتے رہے اُن کی تہ میں صرف یہ جذبہ کارفرما تھا کہ قرآن مجید کو خوبصورت سے خوبصورت انداز میں لکھا جائے تاکہ

لوگ اُسے صحت کے ساتھ پڑھ سکیں - الاستاذ سید ابراہیم اپنے مقالے الخط العربی اصلہ ونطورہٗ میں اس حقیقت پر تبصرہ کرتے ہوئے تحریر کرتے ہیں !

لقد کان القرآن الکریم ھو الروح الحی الذی قاد قافلۃ الابداع الفنی فی عالم المسلمین جمیعا واخذ الخط کفن نصیبہ الاوفی من ذلک الابداع -

الانشاء : دورِ جاہلیت کی انشاء اور نثر کے نمونوں میں سے سوائے کاہنوں کے سجع اور دو مشہور کاہنوں شق وسطیح کے اقوال کے اور کچھ ہم تک نہیں پہنچا یہ سجع اور اقوال، بے معنی، لغو اور رکیک ہونے کے باعث ذوقِ سلیم پر گراں ہیں۔ ظہورِ اسلام کے بعد انشاء میں بھی خطابت کی طرح بہت ترقی ہوئی اور انشاء پرداز فصیح و بلیغ اُسلوب میں اپنے مافی الضمیر کا اظہار کرنے لگے کاتب ایجاز اور بلاغت میں قرآن مجید کے اسلوب کی پیروی کرتے اور آنحضورؐ کی حدیث "اوتیت جوامع الکلم واختصرلی الکلام اختصارا" کے تتبع میں حتی الامکان اختصار سے کام لیتے اُن کی ہر ممکن کوشش ہوتی کہ کم از کم الفاظ میں زیادہ سے زیادہ معانی کو سمودیں - کاتب حضرات اپنی تحریر کو بلیغ و فصیح بنانے اور اُس میں زور پیدا کرنے کے لئے اپنی مراسلت میں حسب حال آیات قرآنی درج کر دیا کرتے تھے جو نثر سجع اور نظر یہ کی صورت میں اصل عبارت میں شامل ہوجاتیں یہ رواج آج تک باقی ہے - قرآن مجید نے عربی انشاء پر جو گہرا اثر ڈالا اُس کے بیان کے لئے حضرت علیؓ کے بلیغ خطبات و رسائل کا ذکر کافی ہے بنو امیہ کے دور میں خطوط نویسی اور انشاء اسی انداز پر رہی، ولید بن عبدالملک کے دور میں قرآنی اُسلوب کو چھوڑ کر تصنع و تکلف کا ارتکاب ہونے لگا - لیکن حضرت عمر بن عبدالعزیز کے دور میں پھر پُرانے اُسلوب کو اپنا لیا گیا - بنو عباس کے دور میں بہت سے عظیم ادیب اور انشاء پرداز پیدا ہوئے جن میں عبداللہ ابن المقفع، سہل بن ہارون، ابن العمید الصاحب بن عباد اور بدیع الزمان الہمذانی خاص طور پر قابل ذکر ہیں - ان جملہ انشاء پردازوں کے اسلوب پر قرآنی اندازِ بیان کا بڑا گہرا اثر نظر آتا ہے اور ان کے رسائل و تحریرات میں ہمیں قرآن مجید کے الفاظ تراکیب اور آیات کثرت کے ساتھ نظر آتی ہیں -

علوم قدیمہ جاہلیہ پر قرآن مجید کے اثرات کے اس مختصر سے جائزے کے بعد اب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ قرآن مجید کے زیر اثر عربی زبان میں کون کون سے نئے علوم پیدا ہوئے۔ جرجی زیدان اپنی کتاب "تاریخ آداب اللغۃ" میں لکھتے ہیں کہ مسلمانوں کے تمدن کے دورِ عروج میں اسلامی علوم و فنون کی تعداد بڑھتی ہی گئی حتیٰ کہ اُن کی تعداد تین صد سے تجاوز کر گئی: "واکثرها نشأ من القرآن الکریم او تولد خدمۃ له" ۔ ان میں سے بیشتر قرآن مجید سے مستخرج ہیں یا قرآن مجید کی افہام و تفہیم میں مدد کرنے کے لیے وضع کیے گئے ہیں۔

علامہ جلال الدین نے اپنی کتاب "الاتقان فی علوم القرآن" میں خاص قرآنی علوم کی تعداد ۸۰ بیان کی ہے [illegible] میں سے ہر علم پر علمائے اسلام نے مستقل کتابیں تحریر کی ہیں جن کا تذکرہ [illegible] مصنف نے [illegible]پی کتاب میں کیا ہے۔ علامہ سیوطی سے قبل بھی علماء نے علوم القرآن کے موضوع پر کتابیں لکھیں جن میں ابن الجوزی کی دو کتابیں فنون الافنان فی علوم القرآن اور المجتبیٰ فی علوم تتعلق بالقرآن اور بدر الدین الزرکشی کی البرهان فی علوم القرآن خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ علامہ سیوطی نے الزر کشی کی کتاب سے بہت فائدہ اٹھایا ہے۔ مختصر یہ ہے کہ قرآن پاک ایک مخزن علوم و فنون اور منبع اسرار و حقائق اور سرچشمہ اصولِ دین ہے اور اس خصوصیت میں کوئی آسمانی کتاب اس کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ اگر ہم صرف ان علوم کے نام ہی گنوانا چاہیں جو قرآن مجید سے متفرع ہوئے یا اسکی خدمت کیلئے وضع کیے گئے تو بہت وقت درکار ہوگا جس کی ہماری آج کی یہ مجلس متحمل نہیں۔ لہذا میں صرف چند اہم علوم کے تذکرے پر ہی اکتفا کروں گا۔

قراءۃ القرآن یہ علم خاص قرآن مجید کی خدمت کے لئے وضع کیا گیا جس سے بعد میں سات علوم متفرع ہوئے یعنی علم الشواذ، علم مخارج الحروف، علم مخارج الالفاظ، علم الوقوف، علل القرآن، کتابۃ القرآن، آداب کتابۃ المصحف۔ ان جملہ علوم پر مستقل تصانیف موجود ہیں

نحو اسلامی فتوحات کے دائرے کے وسیع ہونے اور غیر عربوں کے اسلام قبول کرنے کے بعد عربی زبان کے قواعد مرتب کرنے کی ضرورت بڑی شدت سے محسوس کی جانے لگی۔ کیونکہ ان کی معمولی سی غلطی سے معانی قرآن میں

بڑا فرق پیدا ہوجاتا ہے۔ بیان کیا جاتا ہے کہ ایک مرتبہ ابوالاسود الدؤلی نے ایک شخص کو قرآن مجید کی آیت ان اللہ بریٔ من المشرکین و رسولہ پڑھتے سنا وہ رسولہ کو المشرکین پر عطف زیر کے ساتھ پڑھ رہا تھا۔ اس پر اُس نے نحو کے ابواب عطف و لغت تالیف کئے جو عربی نحو کے بہت اہم اجزاء ہیں۔ قرآن مجید کو صحت کے ساتھ پڑھنے کے جذبے سے یہی رفتہ رفتہ جملہ قواعد نحو مرتب ہوئے جب سیبویہ نے عربی علم نحو پر اپنی مشہور و معروف کتاب "الکتاب" نامی مرتب کی تو اُس نے مختلف نحوی مسائل کی وضاحت کے لئے صرف قرآن مجید سے ہی شواہد دیئے۔ اسی سے یہ ثابت ہوجاتا ہے کہ بنیادی طور پر علم نحو قرآن مجید کی اساس پر مرتب کیا گیا ہے دوسری صدی ہجری کے خاتمے سے قبل علم نحو مکمل طور پر مرتب ہو چکا تھا۔ یونانیوں نے اپنی سلطنت کے قیام کے کئی سو سال بعد اپنی نحو کی تدوین کی جبکہ رومیوں نے یہ کام چھ صدیوں میں انجام دیا۔ عربوں نے یہ کام قرآن مجید کو صحت کے ساتھ پڑھنے کے جذبے کی بناء پر ایک صدی میں کر ڈالا۔

ادب و لغت

چونکہ قرآن پاک عربی زبان میں ہے اس لئے اس کو سمجھنے کے لئے عربی ادب، زبان اور لغت سے واقفیت ضروری ہے۔ چنانچہ علم ادب اور علم لغت کی تدوین بھی قرآن مجید کی خدمت کے لئے ہی کی گئی۔ علماء کی ایک کثیر تعداد نے اسالیب عرب، اقوال عرب۔ قدیم اشعار اور ضرب الامثال وغیرہ کو کتابی صورت دینی شروع کی تاکہ ان کے ذریعے وہ قدیم عربی زبان پر پورا پورا عبور حاصل کر سکیں اور اس طرح قرآن مجید کے معانی و مضمرات کو کما حقہ سمجھ سکیں۔ حضرت ابن عباس کے قول: اذا قرأتم شیئاً من کتاب اللہ ولم تعرفوہ فاطلبوہ فی الاشعار لان الشعر دیوان العرب کی بنا پر علماء کی توجہ علم ادب کے حصول کی طرف ۔ خاص طور پر مبذول ہوگئی۔

علم ادب سے ۲۰ سے زائد علوم متفرع ہوئے۔ جن میں سے اہم، صرف، اشتقاق، معانی، بیان، بدیع اور عروض ہیں یہ سب علوم قرآن مجید کی خدمت کے لئے معرض وجود میں آئے۔

علم تفسیر تو خاص قرآنی علم ہے اور اس کی تدوین قرآن مجید کے معانی صحیح طور پر

سمجھنے اور سمجھانے کے لئے کی گئی - علم حدیث اور علم رجال بھی اسی مقصد کے لئے معرض وجود میں آیا - علم فقہ، قرآن مجید سے احکام شرعیہ استنباط کرنے کے لئے وضع کیا گیا - عربی زبان میں علم تاریخ کا مطالعہ اور ترتیب بھی قرآنی اثرات کے تحت ہی شروع ہوئی - اس کی تفصیل یہ ہے کہ جب مفسرین کرام نے تفسیریں لکھنی شروع کیں تو انہیں قرآن مجید میں امم قدیمہ کے بارے میں مذکور واقعات کی تفصیلات معلوم کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی جس کی بنا پر انہوں نے یہ معلومات حاصل کرنے اور انہیں ترتیب دینے کا عمل شروع کیا جس سے علم تاریخ معرض وجود میں آیا - حدیث، فقہ، نحو، ادب وغیرہ کے اماموں کی جہان پھٹک کے لئے طبقات کا علم پیدا ہوا اور طبقات الشعراء، طبقات المفسرین، طبقات النحویین طبقات المفسرین اور طبقات اللغویین واللغاۃ پر کتابیں لکھی گئیں -

علم جغرافیہ اور تقویم البلدان کا مطالعہ بھی قرآن مجید کے اثرات کے تحت ہی شروع ہوا - قرآن مجید میں متعدد آیات موجود ہیں جن میں تقویم اور جغرافیہ کے علم حاصل کرنے پر رغبت دلائی گئی ہے - مثلاً : اَفَلَمْ یَسِیْرُوْا فِی الْاَرْضِ فَتَکُوْنَ لَهُمْ قُلُوْبٌ یَّعْقِلُوْنَ بِهَآ اَوْ اٰذَانٌ یَّسْمَعُوْنَ بِهَا فَاِنَّهَا لَا تَعْمَی الْاَبْصَارُ وَلٰکِنْ تَعْمَی الْقُلُوْبُ الَّتِیْ فِی الصُّدُوْرِ ان آیات میں مذکور احکام کی پیروی میں مسلمانوں نے جغرافیہ اور تقویم البلدان کا مطالعہ شروع کیا اور اس علم کو معراج کمال تک پہنچایا - حج بیت اللہ کے لئے اطراف واکناف دنیا سے حجاز کی طرف سفروں اور اس طرح حدیث اور دیگر علوم کے علماء کے دنیا کے مختلف گوشوں کی طرف حصول علم کی خاطر سفروں کی بنا پر بھی تقویم البلدان اور جغرافیہ کی تدوین کی ضرورت محسوس ہوئی - خراج اور جزیہ کے بارے میں فقہی احکام پر ٹھیک طور پر عمل درآمد کرنے کے لئے بھی تقویم البلدان اور جغرافیہ کا مطالعہ خصوصی طور کیا جانے لگا -

---

مسلمانوں نے اپنے دور عروج میں مختلف سائنسی علوم میں جو کمال حاصل کیا وہ بھی قرآن مجید کی تعلیمات کی بنا پر ممکن ہوا - قرآن مجید صرف مذہبی احکام

وظائف کا مجموعہ نہیں بلکہ اس کتاب نے رُوحانی و اخلاقی اصلاح کے ساتھ ساتھ لوگوں کو رموزِ فطرت اور اسرارِ کائنات یعنی جدید سائنس سے بھی روشناس کرایا۔ قرآن مجید نے بغیر سوچے سمجھے آنکھیں بند کرکے مان لینے کا حکم نہیں دیا بلکہ عقل استعمال کرکے اُسی کے ذریعے ہستی باری تعالےٰ کو پہچاننے کا حکم دیا ہے۔ اوہام باطلہ اور مشرکانہ ضعیف الاعتقادیوں کی تکذیب و تردید کرکے لوگوں کو دعوت دی ہے کہ وہ اپنے گرد و پیش پر نظر ڈالیں رموزِ فطرت سمجھنے کی کوشش کریں، زمین و آسمان کے اسرار پر غور و خوض کریں۔ اجرام سماوی کے عقدے حل کرنے کی سعی کریں۔ اگر وہ ان پر غور کریں گے تو اُن کی فطرت سلیمہ خود بخود اُن کی راہنمائی اُسی ہستی کی طرف کردے گی جو ان جملہ اشیاء کی منتظم و مدبر ہے۔

قرآن پاک نے علوم دینی و دنیوی میں تفریق نہیں کی۔ بلکہ تمام ان علوم کو جن کے بارے میں انسان رموزِ کائنات کو سمجھ سکے اور ہستی باری تعالےٰ تک پہنچ سکے۔ سیکھنا لازمی قرار دیا ہے۔ قرآن پاک نے بار بار لوگوں کو علم حاصل کرنے پر اُبھارا ہے۔ لفظ علم یا اُس کے مشتقات کا تذکرہ قرآن کریم میں ۷۶۵ مرتبہ ہوا ہے۔ تقریباً ۷۵۰ ایسی آیات ہیں جن میں مختلف کائناتی علوم کا ذکر ہے۔ قرآن مجید میں بجز الفاظ اللہ کے کوئی کلمہ علم سے زیادہ نہیں دہرایا گیا۔ یہ قرآن کی نظروں میں علم کی عظمت و جلالت کی بہت بڑی دلیل ہے۔ حضرت محمد صلے اللہ علیہ وسلم پر جو سب سے پہلی وحی نازل ہوئی اُس میں لکھنے پڑھنے اور علم حاصل کرنے کی رغبت دلائی گئی۔ قرآن پاک میں علم فلک، نیچرل سائنس، پہاڑوں، دریاؤں، نباتات، آسمان، ابر، پانی

ہوا اور رُوح کے متعلق اعلیٰ معلومات حاصل کرنے اور ان چیزوں میں جو قوانین قدرت کے راز پوشیدہ ہیں کا پتا چلانے کی ہر ہر ڈگر ہدایت موجود ہے۔

اللہ تعالےٰ نے قرآن مجید میں اپنی پیدا کی ہوئی کئی چیزوں کی قسم کھائی ہے۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ خدائے پاک کو ان مخلوقات کی قسم کھانے کی کیا ضرورت تھی۔ نوع انسانی ایسی چیزوں کی قسم کھایا کرتی ہے جن سے اُسی کو فائدہ پہنچتا

ہو اور اس بنا پر وہ ان اشیاء کی قدر کرتی ہے - خداوند کریم نے انسان کے اس فطری میلان کی بنا پر اپنی بعض قابل قدر مصنوعات و مخلوقات کے فوائد اس پر آشکار کرنے کا یہ اسلوب اختیار کیا ہے کہ اُن کی قسم کھائی ہے اور اس طرح انسانوں کو اُن اشیاء کی طرف متوجہ کیا ہے تاکہ وہ اُنہیں پہچانیں اور ان کے فوائد سے خبردار ہوکر نفع اُٹھائیں - اُن کی قسم کھانے کا حاصل صرف یہ ہے کہ انسان ان کا علم حاصل کرے اور مصنوعات باری تعالےٰ کے عجائب و غرائب سے واقف ہو کر اُنکی عظمت و جلالت کا قائل ہو -

پروردگار عالم نے اجرام علوی اور اُن کے خواص اور روشنیوں اور مواقع کی بیسیوں قسمیں کھائی ہیں - اس کے بعد رات کے چلنے کی قسم یوں کھائی ہے - واللیل اذا لیس پھر قمری مہینے کی پہلی رات کی قسم اس لئے کھائی ہے کہ اس میں اندھیرے کا حصہ روشنی پر غالب رہتا ہے - ستارہ ڈوبنے کی قسم (والنجم اذا ھوی) اس کے ڈوبنے پر تنبیہ کرنے کے لئے کھائی - ستاروں کے مواقع اور ان کے دورکے دائروں کی بھی قسم کھائی ہے - پھر فرمایا: فانہ لقسم لو تعلمون عظیم - یعنی اگر تم معلوم کرو تو یہ ایک بہت بڑی قسم ہے - اس سے بجز اس کے اور کیا معلوم کیا جا سکتا ہے کہ قسم کھا کر انسان کو مقسم بہ کی اہمیت سے آگاہ کیا گیا ہے تاکہ وہ ستاروں کے مواقع، ان کے اندازوں، دائروں اور حرکات و سکنات کی معرفت و شناخت حاصل کرے -

فلک اور اجرام سماوی کی قسم کھا کر اور ان کی اہمیت کی طرف توجہ دلا کر پروردگار عالم نے ایسی چیزوں کی اہمیت بتائی ہے جو آسمان کے نیچے یا کرۂ ارضی کو محیط ہیں - اس سلسلے کو غبار اُڑانے والی ہواؤں کے ذکر سے شروع کیا اور فرمایا :

________ والذاریات ذروا، پہاڑوں کی قسم کھائی، والتین والزیتون وطور سینین وھذا البلد الامین - گھوڑے کی بھی قسم کھائی والعادیات ضبحا پھر ایک ہی جنس اور محسوس ہونے والی چیز کی قسم کھائی اور فرمایا وشاھد ومشھود یہ علویات اور سفلیات کی قسمیں اس بات کا فائدہ دیتی ہیں کہ خداوند کریم نے اپنے بندوں کو ان امور کی اہمیت سے

روشناس کرا کر ان پر حساب، ہندسہ، نجوم، طبیعیات کیمیا اور علم النفس وغیرہ تمام علوم کا جاننا لازمی قرار دیتا ہے۔ اس لئے کہ مذکورہ بالا مضمون میں جو خداوند قادر مطلق نے کھائی ہیں انہی چیزوں کی طرف توجہ دلائی ہے جو ان علوم و فنون کا مأخذ اور سرچشمہ ہیں۔

قرآن نے علوم کی طرف متوجہ کرنے کا ایک اور طریقہ بھی استعمال کیا اور وہ یہ کہ علم کی بہت تعریف کی ہے اور اس کے مقابلے میں جہالت کی شدید مذمت کی ہے۔ خداوند تعالےٰ نے علم کل کو اپنی ذات کی طرف منسوب کیا ہے اور یہ علم کی بہت بڑی تکریم ہے۔

قرآن پاک اور رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے واضح ارشادات کی تعمیل میں مسلمانوں نے علوم و فنون کی تحصیل کو اپنا شعار بنا لیا۔ وہ جزیرۃ العرب سے نکل کر جہاں بھی گئے۔ اس جذبے کو ساتھ لے کر گئے۔ مسلمان جب مفتوح ممالک میں داخل ہوئے تو انہوں نے نہ صرف مفتوحین کے علمی مراکز کی حفاظت کی بلکہ اُن کے علماء کی ہر طرح تعظیم و تکریم کی۔ صرف اسی پر اکتفاء نہیں کیا بلکہ خود اپنے مفتوحین کی شاگردی اختیار کر لی اور اس میں کوئی شرم محسوس نہ کی۔ یہ سب قرآن مجید کے واضح احکام کی پیروی میں ہوتا تھا۔ بغداد میں ہارون و مامون اور اُن کے جانشینوں نے اور قرطبہ میں اموی خلفاء اور بعد میں آنے والے بادشاہوں نے تہذیب و ثقافت اور علوم و فنون کی نشوونما کے لئے جو کارنامے انجام دیئے وہ سب کو معلوم ہیں اور اُن کا دہرانا تحصیل حاصل ہے۔

مختصر یہ کہ مسلمانوں نے مختلف علوم و فنون کی طرف اپنی توجہ قرآن مجید کے احکام کی پیروی میں ہی منعطف کی، اور عربی زبان میں علوم کا جو سرمایہ موجود ہے وہ سب کا سب واضح قرآنی احکامات کی تعمیل میں پیدا ہوا۔ لہٰذا میں یہ کہنے میں حق بجانب ہی ہوں کہ عربی زبان میں موجود تمام دینی و دنیاوی علوم کا سرچشمہ قرآن مجید ہے۔

قسط نمبر ۲

اِنسان:
صلاح و فسادِ عالم کا مرکزی کردار

از قلم :- مولانا لطف الرحمٰن بنوی (معلم قرآن اکیڈمی)

بدن میں دل کی حیثیت متعین ہو جانے کے بعد آئیے اب انسان کی صحت و فساد، کائنات میں اس کے مقام و مرتبے اور پورے عالم پر اس کے احوال کی اثر اندازی کی کیفیت معلوم کرنے کی کوشش کریں۔

روحِ انسانی تو ایک لاہوتی حقیقت ہے جو لاتعداد حکمتوں کے تحت انسان کے ناسوتی بدن میں اتاری گئی ہے۔ اب یہ مرکب ــــ روح لاہوتی اور بدن ناسوتی ــــ سلسلۂ کائنات میں روحانیات و مادیات کے بیچوں بیچ وہ درمیانی کڑی ٹھہری ہے جس کی کوئی بھی کیفیت جانبین کو یکساں طور پر متاثر کرتی ہے۔

اجزائے لاہوتی اور ناسوتی کے اس اشتراک کی بدولت انسان نہ تو فرشتوں کی طرح فقط لاہوتی غذا سے اپنے وجودِ معجونی کو برقرار رکھ سکتا ہے اور نہ ہی دوسرے حیوانات کی طرح فقط ناسوتی خوراک سے بلکہ اس سلسلے میں اس کو دونوں عالموں سے مناسب مقدار کی حیاتین یعنی ضروری ہیں۔ ان سے حیاتین کی تحصیل کے طور طریقے مزاج و ماحول کی مناسب تبدیلیوں کے ساتھ اس کو سیدنا آدم علیہ السلام سے لے کر محمد صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم تک مختلف شریعتوں کی شکل میں بتلائے اور سکھلائے جاتے رہے، انہیں حیاتین کے ترک و استعمال سے اس کی صحت و فساد کا تعلق ہے اور پھر توسط کے ناطے سے اس کی صحت و فساد کا اثر لاہوت و ناسوت پر بھی پڑتا رہتا ہے۔ جو کائنات کے اجزائے ترکیبی ہیں اور اس طرح سے ساری کائنات اس سے متاثر ہو جایا کرتی ہے[1]

---

[1] ساری کائنات کی عالم انسانی سے اثر پذیری کا تعلق ہے کسی بھی دیدہ ور کو اس میں اختلاف کی مساغ نہیں۔ ہاں یہ ممکن ہے کہ ہمارے اس یا گذشتہ و آئندہ کسی ایسے ہی اظہار ــــ جس میں یہ وتاثر خالص طبیعی رنگ میں ظاہر کیا گیا ہو ــــ سے کسی کو تشویش ہو، اولاً تو ایسے لوگوں کی خدمت میں عرض ہے کہ جس طرح سے کھانے اور پینے کو بھوک اور پیاس کے ازالے میں (باقی اگلے صفحہ پر)

قرآنی ارشاد :

وَلَوِ اتَّبَعَ الْحَقُّ اَهْوَآءَهُمْ لَفَسَدَتِ	"اگر حق (قدرت یا قانون قدرت) ان کے
السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ وَمَنْ فِيْهِنَّ ۝	خواہشات کی تابعداری کرتا تو تمام آسمان و
(سورۃ مومنون آیت ۷۱)	زمین اور جو کچھ ان میں ہے سب تباہ ہو جاتے"

اور حضرات عبداللہ و ابوہریرۃ رضی اللہ تعالیٰ عنہما کے آثار :

بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ : مؤثر سمجھا جاتا ہے حالانکہ اصل مؤثر بالذات تو اللہ تعالیٰ کی مشیت و ارادہ ہی ہے ۔ اسی طرح سے اگر انسانی کردار کو بھی کائنات میں مؤثر سمجھا جائے تو توحش ہو تو ہونا گواری ہرگز نہیں ہونی چاہیئے۔ خصوصاً جبکہ سلف و خلف نے مختلف تعبیرات سے اس پر صاد بھی کیا ہو۔ ہمارے مایۂ ناز متکلم علامہ شبیر احمد عثمانیؒ درس بخاری سے متعلق اپنے آمالی کے اس حصے میں جو "مسئلہ تقدیر" کے عنوان سے ان کی وفات کے بعد ایک رسالے کی شکل میں شائع ہوا ہے فرماتے ہیں :

> "اللہ تعالیٰ کے ہاں مجازات محض بطریق انتقام دنیوی نہیں بلکہ بطور تسبب طبیعی کے ہے یعنی اللہ تعالیٰ نے اس عالم اسباب و مسببات کا ایک طویل و عریض سلسلہ پیدا کیا ہے اور اسباب کے اندر ایک نوع تاثیر رکھ دی ہے کہ جب کوئی سبب وجود میں آتا ہے تو باذن اللہ مسبب اس پر مرتب ہو جاتا ہے ۔ جیسا کہ اس دار دنیا کی چیزوں میں آپ دیکھتے ہیں مثلاً آگ میں قدرت نے احراق کی تاثیر رکھ دی ہے یا زہر میں یہ تاثیر ہے کہ وہ انسان کو ہلاک کر دیتا ہے اب جو شخص بھی زہر کھائے گا بشرط عدم موانع اس کی تاثیر محقق ہو کر رہے گی ۔ خواہ اپنے قصد و ارادے سے کھائے یا جبراً و اکراہاً کوئی اسے کھلا دے وعلیٰ ہذا القیاس ساری دنیا اسی اسباب و مسببات کے سلسلہ میں جکڑ بند ہے اور کوئی نہیں بتا سکتا کہ فلاں سبب میں ایسی تاثیر کیوں ہے کہ اس پر وہی مسبب مرتب ہو"

لیکن پھر بھی اگر کسی حرفیت پسند کو تسلی نہیں ہوتی تو ہمیں ان کے حسب ذوق تعبیر بدلنے میں بھی کوئی عذر نہیں مثلاً یوں کہا جائے کہ شریعت کی اطاعت و فرمانبرداری سے خدا تعالیٰ کی رضا اور سرکشی و نافرمانی سے اس کی ناراضگی کا تعلق ہے چنانچہ ان دونوں صورتوں میں اپنی پسند یا ناپسند کو ظاہر کرنے کے لئے لاہوت و ناسوت میں اپنا وہی ارادہ ظاہر فرما دیتے ہیں جو دونوں کی کارگزاریوں کو متاثر کر کے انسان کے گرد و پیش میں اس کے حسب کردار سازگار یا ناسازگار فضا پیدا کر دے ۔

کاد الجعل ان یھلک فی جحرہ	"بہت ممکن ہے کہ کوئی کیڑا اپنے بل میں
بخطیئۃ ابن آدم (ابن کثیر)	انسانی گناہوں کی وجہ سے ہلاک ہو۔"
ان الحبارٰی لتموت فی وکرھا	"بے شک سرخاب اپنے گھونسلے میں ظالم
بظلم الظالم (ابن کثیر)	کے ظلم کی وجہ سے مرجاتا ہے۔

سے اس حقیقت کی پوری پوری وضاحت ہوجاتی ہے۔ علاوہ ازیں اس سلسلے میں حکماء کی دونوں جماعتوں یعنی اہلِ کشف و وجدان اور ارباب دلیل و برہان کی تصریحات بھی موجود ہیں چنانچہ علامہ عبدالوہاب شعرانی "الیواقیت والجواھر" میں محی الدین ابن عربی کی "فتوحات مکیہ" سے بعثتِ انبیاء کی حکمتوں کے ذیل میں شیخ کی یہ عبارت نقل فرماتے ہیں۔

"وہ تمام حدود جو اللہ تعالیٰ نے مقرر فرمائی ہیں دو قسموں سے خالی نہیں۔ ان میں سے ایک قسم سیاستِ حکمیہ اور دوسری شریعت کہلاتی ہے۔ اور دونوں کو اسی لئے نافذ کیا گیا ہے کہ اس دنیا میں اعیانِ ممکنات باقی اور فساد سے سالم اور محفوظ رہیں۔"

گویا کہ ابن عربیؒ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ شریعت اس نہجِ عمل کا نام ہے جو اعیانِ ممکنات کی صحت اور بقا میں مؤثر ہے اگر انسانوں کے اعمال اس نہج سے ہٹ جائیں تو اس کا لازمی نتیجہ فسادِ کائنات کی صورت میں نمودار ہوگا۔

اسی طرح سے امام غزالیؒ نے اپنے ایک رسالے "مجربات" میں وہی کچھ لکھا ہے جس سے مذکورہ بالا معروضات کی پوری پوری تائید ہوتی ہے۔ آپ تحریر فرماتے ہیں:

"واضح ہو کہ نبض قلب کی دلیل ہے اور قلب تمام عالم کی نبض ہے۔ پس جس طرح دل کا حال نبض سے معلوم ہوتا ہے اسی طرح تمام عالم کا حال دل سے معلوم ہوتا ہے۔ رئیس الحکماء فرماتے ہیں کہ علمِ ظاہر میں نبضِ دل پر دلالت کرتی ہے اور علمِ حقیقت میں دل تمام مخلوقات پر دلالت کرتا ہے۔"

یہ عبارت بھی اس مفہوم میں بڑی صاف اور واضح ہے کہ انسانی دل وہ مرکزِ ثقل ہے جس کی استواری سے پوری کائنات کی استواری اور اس کی کجی سے تمام عالم میں کجی پیدا ہوتی ہے۔ اس مدعا پر مزید روشنی حافظ عماد الدین ابن کثیرؒ کے اس بیان سے پڑتی ہے جس کو انہوں نے اپنی تفسیر میں ابو العالیہؒ کے حوالے سے قلمبند فرمایا ہے اور جس کا اردو ترجمہ

علامہ امیر علی نے "تفسیر مواہب الرحمٰن" میں یوں پیش کیا ہے :

"ابو العالیہ نے فرمایا کہ جس نے زمین پر اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کی تو اس نے فساد پھیلایا کیونکہ صلاح زمین و آسمان تو اللہ تعالیٰ کی بندگی کے ساتھ ہے اور امام عادل اسی واسطے بدکاروں پر سزائیں قائم کرتا ہے کہ زمین میں معصیت نہ ہونے پائے۔ اسی واسطے حدیث میں آیا ہے کہ زمین میں ایک سزائے حد قائم ہونا اس ملک والوں کے لئے چالیس دن پانی برسنے سے بہتر ہے۔ اور اس میں بھید یہ ہے کہ جب حد قائم کی گئی تو سب لوگ یا بہتیرے اسی خوف سے مرتکب معاصی نہ ہوں گے اور جب معصیت نہ ہوگی تو رحمت الٰہی سے برکت سماوی و ارضی ظاہر ہوگی۔ اسی وجہ سے آخر زمانے میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام اتریں گے اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی شریعت کے موافق حکم کریں گے حتیٰ کہ سور اور صلیب کو تباہ کریں گے اور جزیہ موقوف کر کے صرف اسلام قبول کریں گے پھر آپ کے زمانے میں دجال اور اس کے تابعین مارے جائیں گے۔ اور یاجوج و ماجوج مریں گے۔ اور نتیجہ یہ ہوگا کہ زمین فساد سے خالی ہو جائے گی تو پھر زمین کو یہ حکم ہوگا کہ اپنی برکت ظاہر کر حتیٰ کہ ایک انار سے ایک جماعت سیر ہو جائے گی اور ایک رود دھار جانور کا دودھ ایک جماعت کے واسطے کافی ہوگا اور یہ سب اس وجہ سے ہوگا کہ شریعت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نافذ ہوگی۔ پس ظاہر ہوا کہ جس قدر عدل قائم کیا جائے برکت کی کثرت ہوگی اور حدیث میں موجود ہے کہ جب مرد بدکار مرجاتا ہے تو اس سے لوگوں، شہروں، جانوروں اور درختوں کو راحت ہوتی ہے۔"

قرآن مجید کی مندرجہ ذیل آیت سے بھی اس لمبے اقتباس کے آخری جملے کی پوری پوری توثیق ہوتی ہے۔

اِنَّ الَّذِیْنَ یَکْتُمُوْنَ مَآ اَنْزَلْنَا مِنَ الْبَیِّنٰتِ وَالْھُدٰی مِنْ بَعْدِ مَا بَیَّنّٰہُ لِلنَّاسِ فِی الْکِتٰبِ ۙ اُولٰٓئِکَ یَلْعَنُھُمُ اللّٰہُ وَیَلْعَنُھُمُ اللّٰعِنُوْنَ ۝

(سورۃ البقرۃ آیت ۱۵۹)

"جو لوگ ان مضامین کو چھپاتے ہیں جو ہم نے نازل کئے جو کہ واضح ہیں اور ہادی ہیں اس کے بعد کہ ہم ان کو کتاب میں لوگوں پر ظاہر کر چکے ہیں ایسے لوگوں پر اللہ تعالیٰ بھی لعنت فرماتے ہیں اور لعنت کرنے والے بھی۔"

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے لاعنون کو متعیّن نہیں فرمایا۔ امام تفسیر مجاہدؒ اور عکرمہؒ نے فرمایا کہ اس عدم تعیین سے اشارہ اس بات کی طرف ہے کہ دنیا کی ہر چیز اور ہر مخلوق اس پر لعنت کرتی ہے۔ یہاں تک کہ تمام جانور اور حشرات الارض بھی ان پر لعنت کرتے ہیں۔ کیونکہ ان کی بداعمالی سے ان سب مخلوقات کو نقصان پہنچتا ہے۔ حضرت براء ابن عازب رضی اللہ تعالیٰ عنہٗ کی حدیث سے اس کی تائید ہوتی ہے۔ جس میں انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ سے نقل فرمایا ہے کہ لاعنون سے مراد تمام زمین پر چلنے والے جانور ہیں۔ (معارف القرآن)

اس تحقیق سے یہ بات نکھر کر سامنے آگئی کہ عالم کی صلاح و فساد انسان کے ان اختیاری اعمال سے وابستہ ہے جو ادیانِ سماویہ کا موضوع بحث بنے رہے ہیں۔ چنانچہ احکامِ الٰہیہ کے پیروکار عالم کی اصلاح اور ان کو توڑنے اور پامال کرنے والے اس کے فساد کا سبب ہیں۔ اب اس نتیجے کی روشنی میں :-

وَمَنْ يَقْتُلْ مُؤْمِنًا مُتَعَمِّدًا فَجَزَآؤُهٗ جَهَنَّمُ خَالِدًا فِيْهَا وَغَضِبَ اللّٰهُ عَلَيْهِ وَلَعَنَهٗ وَاَعَدَّ لَهٗ عَذَابًا اَلِيْمًا (سورۃ النساء آیت ۹۳)	"اور جس نے کسی مومن کو جان بوجھ کر قتل کیا اس کی سزا جہنم ہے وہ ہمیشہ اسی میں رہیگا اس پر اللہ تعالیٰ کا غضب ہوگا اور لعنت ہوگی اور اس کے لئے بڑا عذاب ہے۔"
لو ان اهل السموٰت والارض اشتركوا فی دم المومنين لاكبهم الله فی النار (مشکوٰۃ)	"اگر تمام آسمانوں اور زمین والے کسی ایک مسلمان کو مل کر قتل کردیں تو اللہ تعالیٰ ان سب کو اوندھے منہ دوزخ میں جھونک دیگا۔"
ان الله وملئكته واهل السموٰت والارض حتى النملة فی جحرها وحتى الحوت ليصلون على معلم الناس الخير۔ (مشکوٰۃ)	بے شک اللہ تعالیٰ اور اس کے فرشتے اور آسمان و زمین کے رہنے والے یہاں تک کہ چیونٹیاں اپنے بلوں میں اور مچھلیاں سب لوگوں کو بھلائیوں کی ترغیب و تعلیم دینے والوں کو دعائیں دیتی ہیں۔"

یا ان جیسی دوسری احادیث و آیات کا جائزہ لیجئے جو صالحین کی اضاعت یا صلاح کاری کی اشاعت کرنے والوں کے بارے میں وارد ہوئی ہیں تو عمل اور اس کی بازگشت کی مناسبت کا بخوبی اندازہ ہو جائے گا۔

انفعال اور تاثر کے بارے میں عالم اس قدر حساس واقع ہوا ہے کہ انسان کے کسی بھی اچھے یا برے عمل سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہتا۔ عبادہ ابن صامتؓ کی روایت:

خرج النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم	"نبی علیہ السلام ہمیں لیلۃ القدر کی خبر دینے
یخبرنا بلیلۃ القدر فتلاحی رجلان	کے لئے نکلے تو دو مسلمان آپس میں جھگڑے
من المسلمین فقال خرجت لاخبرکم	آپ نے فرمایا میں تو لیلۃ القدر کی خبر دینے
بلیلۃ القدر فتلاحی فلان وفلان	کے لئے نکلا لیکن فلاں اور فلاں آپس میں
فرفعت: (مشکوٰۃ باب لیلۃ القدر)	لڑے چنانچہ اس کا علم اٹھا لیا گیا۔"

یا ایک دوسرے صحابی (بقول میرک شاہ اعز الغفاری، مرقات) کی روایت:

ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم	"ایک دفعہ نبی علیہ السلام نے فجر کی نماز
صلی صلوٰۃ الصبح فقرأ الروم فالتبس	پڑھائی اور اس میں سورۃ روم تلاوت
علیہ فلما صلی قال مابال اقوام یصلون	فرمائی جس میں آپ کو اشتباہ ہوا جب
معنا لا یحسنون الطھور وانما یلبس	نماز سے فارغ ہوئے تو فرمایا ان لوگوں
علینا القرآن اولئک (مشکوٰۃ کتاب الطہارۃ)	کا کیا حال ہے جو ہمارے ساتھ جماعت میں

شریک ہوتے ہیں اور وضو اچھی طرح نہیں کر کے آتے ہیں جس سے ہمارے اوپر اشتباہ پڑتی ہے۔" یہی لوگ (غالباً منافقین ہیں۔ تہدید آیا بذریعہ وحی تحقیقاً)

یا ترمذی شریف کی حدیث:

لاتقوم الساعۃ حتی لا یقال فی	"قیامت اس وقت تک قائم نہ ہوگی
الارض اللہ اللہ!	جب تک کہ یہ صورتحال پیدا نہ ہو کہ زمین

میں اللہ اللہ کہنے والا کوئی بھی باقی نہ رہے۔"

میں یہی بات بیان ہوئی ہے کہ کسی بھی معصیت کا انعکاس اس حد تک عام ہے کہ انبیاء تک اس سے متاثر ہو جاتے ہیں اور اسیطرح سے ایک آدمی کا ایمان اور اس کی اطاعت گزاری فساد کو اس انتہا پر پہنچنے نہیں دیتی جو قیامت کی صورت میں بربادیٔ عالم کا ہنگامہ برپا کر دے

اعمال اختیاریہ کے اسی تأثر سے انسانی اشخاص وجماعات کے نقشوں میں سعادت اور شقاوت کی رنگ آمیزیاں ہوتی ہیں اور قسام ازل کے علم وارادے کے عین مطابق عمل و کردار کی مناسبت سے صالحین وفاسقین کی تقسیم عمل میں آتی ہے اس حقیقت کے پیش نظر

قرآن وحدیث میں تدبر کریں تو

وَكُلَّ اِنْسَانٍ اَلْزَمْنٰهُ طٰٓئِرَهٗ فِيْ عُنُقِهٖ وَنُخْرِجُ لَهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ كِتٰبًا يَّلْقٰهُ مَنْشُوْرًا ۝

(سورۃ بنی اسرائیل آیت ۱۳)

اور ہم نے ہر انسان کا عمل اس کے گلے کا ہار بنا کر رکھا ہے۔ قیامت کے دن اس کا نامۂ اعمال اس کے واسطے نکال کر سامنے کر دیں گے جس کو وہ کھلا ہوا دیکھ لے گا۔

وَاتَّقُوْا فِتْنَةً لَّا تُصِيْبَنَّ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مِنْكُمْ خَاصَّةً ۚ

(سورۃ انفال آیت ۲۵)

اور تم ایسے وبال سے بچو جو خاص انہی لوگوں پر واقع نہ ہوگا جو گناہ کے مرتکب ہوئے ہیں (بلکہ غیر مرتکبین بھی اس کی لپیٹ میں آئیں گے)

مثل المدهن فی حدود الله و الواقع فیها مثل قوم استهموا سفینة فصار بعضهم فی اسفلها وبعضهم فی اعلاها فکان الذی فی اسفلها یمرّ بالماء علی الذین فی اعلاها فتاذوا به فاخذ فأساً فجعل ینقر اسفل السفینة فأتوه فقالوا مالك فقال تأذیتم ولا بدّ لی من الماء فان اخذوا علی یدیه انجوه و نجوا انفسهم وان ترکوه اهلکوه واهلکوا انفسهم (بخاری)

اللہ تعالیٰ کے حدود و احکام میں تساہل اور رواداری سے کام لینے والے اور ان کو توڑنے والے اس قوم کی مانند ہیں جنہوں نے (کسی بحری سفر کے لئے) مل کر ایک کشتی لی پھر بعض اس کی بالائی اور بعض اس کی نچلی منزل میں ٹھہرے پس نچلی منزل والا کوئی شخص (پانی لینے کے لئے) بالائی منزل والوں پر سے گزرتا جس سے ان کو تکلیف ہونے لگی۔ (جو پانی لے جانے والے نے بھی محسوس کی) چنانچہ اس نے ایک کلہاڑا لیا اور کشتی کے نچلے حصے کو چھیدنے لگا (یہ دیکھ کر) بالائی منزل والے اسکے پاس آئے اور پوچھا کہ یہ کیا کر رہے ہو! اس نے کہا کہ تم میری (آب آوری کی) وجہ سے تکلیف میں پڑ گئے اور مجھے بھی اس سے چارہ نہیں۔ اب اگر انہوں نے اسے روکا تو خود

بھی تباہی سے بچے اور اس کو بھی بچایا اور اگر اس کو یونہی چھوڑا تو اس کو بھی ہلاک کیا اور خود بھی ہلاک ہوئے۔

جیسی آیات واحادیث کی تفسیر وتشریح میں کوئی دقت پیش نہیں آئے گی۔

اس بحث کو ہم نے اتنی طوالت اس لئے دی کہ پورے مالہا و ماعلیہا کے ساتھ یہ بات ثابت اور ذہن نشین ہو جائے کہ عالم کون میں انسان کو وہی مرکزی حیثیت حاصل ہے جو خود اس کے بدن میں دل کو حاصل ہے۔ اس تشبیہ کو امام غزالیؒ نے "احیاء العلوم" میں اس طرح بیان فرمایا ہے:-

وذلك من جنس تعلق الملك با	اور یہ (یعنی اعضاء و دل یا انسانی ظاہر
لملكوت واعنى بالملك عالم الشهادة	وباطن کا تعلق) ملک اور ملکوت کے تعلق
لمدرك بالحواس وبالملكوت عالم	کے قبیل سے ہے ملک سے مراد وہ
الغيب المدرك بنور البصيرة:	عالم شہادۃ (انسان اور اس کے اعمال

سمیت) ہے جس کا حواس سے ادراک کیا جا سکتا ہے اور ملکوت سے مراد عالم غیب (انسانی اعمال کی تاثیرات سمیت) ہے جو نور بصیرت سے معلوم کیا جا سکتا ہے۔

اور پھر اسی سلسلے میں مزید فرمایا کہ دونوں (ملک و ملکوت) کا باہمی تعلق اسی قدر نرم ونازک اور غیر مرئی ہے کہ اکثر لوگ اس کا صحیح ادراک نہیں کر پاتے اس لئے گمراہیوں کی مختلف وادیوں میں بھٹک جاتے ہیں۔

ولطف الارتباط ودقته بين	اور ان دونوں عالموں (ملک وملکوت)
العالمين انتهى الى حد ظن بعض	کے تعلق کی نزاکت اس حد تک پہنچی
الناس اتحادهما بالاخر وظن	ہوئی ہے کہ بعض لوگوں نے تو دونوں
آخرون انه لا عالم	کو ایک ہی چیز سمجھ لیا اور بعض نے یہ گمان
الا عالم الشهادة ومن	کیا کہ عالم شہادۃ کے سوا کچھ ہے ہی نہیں
ادرك الامرين ثم ارتباطهما	اور جس نے ان دونوں کو ان کے صحیح
عبّر عنه	باہمی تعلق کیساتھ سمجھ لیا انہوں نے تعبیروں کی
رق الزجاج ورقت الخمر	وتشابهما فتشاكل الامر

شراب اور پیمانہ دونوں اس قدر صاف وشفاف ہیں کہ حقیقت الامر مشتبہ ہو گئی۔

فکانما خمر ولا قدح وکانما قدح ولا خمر

کبھی یوں لگتا ہے کہ سب شراب ہے پیمانہ نہیں اور کبھی یوں محسوس ہوا کہ یہ سب پیمانہ ہے شراب نہیں۔

خلاصہ اس بحث کا یہ نکلا کہ جس طرح سے عالمِ اصغر (انسان) میں اصل عمل و تاثیر تو دل کی صفت ہے جس کا اثر بدن کے تمام اعضاء میں ظاہر ہوتا ہے اور پھر یہی اثر پلٹ کر دوبارہ بالواسطہ طور پر دل کو بھی متاثر کرتا ہے بعینہٖ اسی طرح عالم اکبر (پوری کائنات) میں مدارِ کار انسانی سیرت و کردار ہے۔ جس سے اس کے مختلف ناک نقشے تشکیل پاتے ہیں لیکن پھر کائنات کے ایک جزء ہونے کی حیثیت سے وہ خود بھی اس سے متاثر ہوتا رہتا ہے۔

اسی تفصیل سے بے خبری کا نتیجہ ہے وہ تمام باطل فلسفے جو الحاد کے مختلف سانچوں میں نمودار ہوئے ہیں اور جن کی ایک بہت بڑی خطرناک صورت ہیگل اور مارکس کا وہ مادی نظریۂ تاریخ ہے جو اشتراکیت کی نظری بنیاد ہے۔

□□□□□□□□□

"اسلام میں خواتین کا مقام"

کے موضوع پر

ڈاکٹر اسرار احمد کا ایک اہم خطاب

ماہنامہ میثاق کے مئی ۸۲ء کے شمارے

یعنی اشاعت خصوصی میں ملاحظہ فرمائیں

مزید برآں

اسی موضوع پر دیگر اصحابِ علم و دانش کی تحریریں بھی

اس اشاعتِ خصوصی میں شامل ہیں

یہ شمارہ دفتر میں محدود تعداد میں موجود ہے

قیمت فی پرچہ (قسم ادنیٰ) -/۶ روپے۔ (قسم اعلیٰ) -/۱۰ روپے

فہم قرآن

اور

خصوصاً قرآن کے منضبط اور مربوط مطالعے کے ضمن میں

ڈاکٹر اسرار احمد

کی نشری (ریڈیو) تقاریر پر مبنی ایک اہم تصنیف

قرآن حکیم کی سورتوں کا اجمالی تجزیہ

سورۃ الفاتحہ تا سورۃ الکہف

ضرور مطالعہ کیجئے

(کتاب کا دوسرا ایڈیشن حال ہی میں چھپ کر آیا ہے)

اعلیٰ سفید کاغذ، عمدہ کتابت اور دیدہ زیب طباعت

ہدیہ : -/۸ روپے

ہر مسلمان پر

حسب صلاحیت و استعداد

قرآن مجید

کے مندرجہ ذیل پانچ حقوق عائد ہوتے ہیں

① ـــــ ایمان و تعظیم ـــــ یہ کہ اُسے مانے

② ـــــ تلاوت و ترتیل ـــــ یہ کہ اُسے پڑھے

③ ـــــ تذکّر و تدبّر ـــــ یہ کہ اُسے سمجھے

④ ـــــ حکم و اقامت ـــــ یہ کہ اُس پر عمل کرے

⑤ ـــــ تبلیغ و تبیین ـــــ یہ کہ اُسے دوسروں تک پہنچائے

ان حقوق سے واقفیت اور آگاہی حاصل کرنے کے لیے

جناب ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کی شہرۂ آفاق تالیف

"مسلمانوں پر قرآن مجید کے حقوق"

کا مطالعہ اِن شاء اللہ العزیز بے حد مفید ہوگا

خیرکم من تعلم القرآن وعلمہ (حدیث نبوی)

(تم میں بہترین لوگ وہ ہیں جو قرآن کا علم حاصل کریں اور اس کے علم کو دوسروں تک پہنچائیں)

نشر القرآن کیسٹ سیریز

از

ڈاکٹر اسرار احمد

امیر تنظیم اسلامی

کے

دروس قرآن

اور

خطابات عام

نشر القرآن کیسٹ سیریز تنظیم اسلامی

۳۶-کے، ماڈل ٹاؤن، لاہور ۱۴

فون:- ۸۵۲۶۱۱